اکتوبر تا دسمبر 2024

فیضانِ ادب (سہ ماہی)

بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

جلد نمبر: 9 شمارہ: 4



مدیر

ڈاکٹر فیضان حیدر



Rs:250

ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، یو۔ پی۔ 275305

Designed by Mohd Wasi Akhtar

فیضانِ ادب (سہ ماہی)
اکتوبر تا دسمبر 2024
ڈاکٹر فیضان حیدر

RNI: UP/URD/2018/74924 ISSN: 2456-4001

Quarterly

FAIZAN-E-ADAB

An International Refereed Research Value Journal with Impact Factor: 3.49

Vol. IX, Issue: IV, October to December 2024



تصویر میں دائیں سے: پروفیسر مشتاق احمد (پرنسپل سی۔ایم کالج)، ڈاکٹر فیضان حیدر، ڈاکٹر محمد خالد انجم عثمانی (صدر شعبہ اردو و فارسی، سی۔ایم کالج)



تصویر میں دائیں سے: ڈاکٹر محمد عطاء اللہ، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر سورج دیو سنگھ (صدر شعبۂ اردو)، امتیاز احمد کریمی (سابق ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ، پٹنہ) پروفیسر ندیم احمد (دہلی)، ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر فیضان حیدر، ڈاکٹر محسن رضا رضوی اور ڈاکٹر سرور عالم ندوی (شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں ۵/اکتوبر ۲۰۲۴ء کو فیضان ادب کے میر تقی میر نمبر کی رسم رونمائی کی ایک یادگار تصویر)

For latest issues of FAIZAN-E-ADAB visit at www.uprorg.in

Editor
Dr.FAIZAN HAIDER

Printed and published by Dr. Faizan Haider on behalf of Urdu And Persian Research Organization, and printed at Scrino Printers, Farooqui Katra, Sadar Bazar, Maunath Bhanjan, and published at Urdu And Persian Research Organization, Purana Pura, Kurthi Jafarpur, Mau, U.P. 275305, Editor: Dr. Faizan Haider, E-Mail: faizanhaider40@gmail.com

سہ ماہی

فیضانِ ادب

بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ

جلد نمبر 9 شمارہ 4

اکتوبر تا دسمبر 2024ء

مدیر

ڈاکٹر فیضان حیدر

ادارۂ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو، یوپی 275305

Quarterly *FAIZAN-E-ADAB*
An International Refereed Research Value Journal with
Impact Factor: 3.49
Vol. IX, Issue: IV, October to December 2024
RNI: UPURD/2018/74924 —— ISSN: 2456-4001
Website: www.uprorg.in

سرپرست: مولانا ارشاد حسین

مدیر: ڈاکٹر فیضان حیدر (+917388886628)

اس شمارے کی قیمت: 250 روپے ☆ سالانہ: 1000 روپے (صرف رجسٹرڈ ڈاک سے)

تخلیقات اور مضامین faizaneadab@gmail.com اور info@uprorg.in پر روانہ کریں۔

ممبر شپ کے لیے بار کوڈ کے ذریعہ یا بینک اکاؤنٹ میں آن لائن رقم ٹرانسفر کی جاسکتی ہے۔

Account No.: 735801010050190, Name: FAIZAN E ADAB, Union Bank of India, Kurthi Jafarpur Branch, Ifsc : UBIN0573582, UPI ID: 8707337737@uboi



فہرست

ادار یہ	: فیضان حیدر	5

تحقیق وتنقید

مہاراجا چندولعل شاداں (بے حد) سیّاس: بادشہ گر	: رؤف خیرؔ	7
رشید افروز کی شعری کائنات	: اسما مسعود	25
علامہ اقبالؔ اور نسل نو	: محبوب حسن	34
ظفرؔ کمالی کی 'رباعیاں': ایک مطالعہ	: عبدالوہاب قاسمیؔ	42
عہد مغلیہ: فن خطاطی ومصوری کا عہد زرین	: محمد قیصر	57
محسن رضا رضویؔ: 'فن ہمارا' کی روشنی میں	: فیضان حیدر	65
ڈاکٹر مقبول احمد مقبول کی تنقید نگاری	: احسن امام احسن	74
اثرؔ انصاری بحیثیت نثر نگار	: عتیق الرحمن	82
اسعد بدایونی کی غزلوں میں کربلائی عناصر	: ناظر حسین خان	90
امیر خسرو کی مثنوی 'قران السعدین' اور ذکرِ دہلی	: قمر حیدر	97
ہرگوپال تفتہؔ اور ان کی مرثیہ گوئی	: ناہید زہرا	105
میرؔ کی سحر البیانی	: عشرت صبوحی	114

نقش ہائے رنگ رنگ

اشاریۂ زبان وادب (ابتدا سے ۱۹۹۹ء تک) [مضامین]	: محسن رضا رضوی	121
حمدیں	: ساجدؔ جلال پوری	172

قندِ مکرر

غزلیں : خواجہ شمس الدین محمد حافظؔ 175

غزلیں : مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ 176

طاقِ نسیاں سے

'فساد نامہ': ۱۸۵۷ء کی ایک تاریخی مثنوی : انصاری عبدالرحمن 178

تعارف و تبصرہ

نام کتاب/مجلہ	مصنف/مرتب/مدیر	تبصرہ نگار	
شہابِ ظفر اعظمی کا مطالعہ شعر	ڈاکٹر محمد منہاج الدین	: فیضان حیدر (معروفی)	183
نکاتِ فن	ڈاکٹر سید الفت حسین	: فیضان حیدر (معروفی)	185
مظفر فہمی	انجینئر فیروز مظفر	: فیضان حیدر (معروفی)	188
سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز (نظم نمبر)	ڈاکٹر منصور خوشتر	: خورشید عالم انصاری	190

اداریہ

آج ہندوستانی مسلمان ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک شاندار ماضی رہا ہے، لیکن موجودہ حالات میں انھیں مختلف سماجی، معاشی اور سیاسی چیلنجز کا سامنا ہے۔ ایک طرف مسلمانوں کو امتیازی سلوک، سماجی تعصب اور معاشی بدحالی کا سامنا ہے، تو دوسری طرف انھیں تعلیمی پسماندگی، سیاسی بے وزنی اور روزگار کی کمی جیسے مسائل درپیش ہیں۔ تاہم ان تمام چیلنجز کے باوجود ان کے پاس ترقی کے بے شمار مواقع موجود ہیں، جنھیں بروئے کار لا کر وہ اپنی صورت حال بہتر بنا سکتے ہیں۔

مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد تعلیمی و معاشی طور پر پسماندہ ہے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ اور دیگر تحقیقی مطالعات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی معاشی حالت دیگر اقلیتی طبقات سے بھی کمزور ہے۔ بے روزگاری، کم اجرت اور تجارتی مواقع کی کمی نے مسلمانوں کو اقتصادی طور پر کمزور کر دیا ہے۔ اس لیے انھیں چاہیے کہ نوکریوں پر مکمل انحصار کرنے کے بجائے کاروباری مواقع تلاش کریں۔ چھوٹے اور درمیانی درجے کے کاروبار، اسٹارٹ اپس اور خود روزگار کے مواقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی معیشت کو مستحکم کریں۔ اسی طرح اپنی غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) اور مالیاتی اداروں کو مستحکم کریں تاکہ نوجوانوں کو وقت ضرورت مالی امداد فراہم کی جا سکے۔

تعلیم کسی بھی قوم کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے، لیکن بدقسمتی سے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال انتہائی تشویشناک ہے۔ تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کی شمولیت کم ہوتی جا رہی ہے، اور جو طلبہ تعلیم حاصل کرتے بھی ہیں، وہ جدید اور پیشہ ورانہ تعلیم میں پیچھے ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیمی شعور پیدا کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جدید تعلیم کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ مسلمانوں کو صرف روایتی تعلیم تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ جدید علوم جیسے سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ اور مینجمنٹ وغیرہ میں مہارت حاصل کرنی چاہیے۔ خاص طور پر آئی ٹی، میڈیکل اور کاروباری تعلیم کے شعبے میں ترقی کرنا بے حد ضروری ہے۔ تاکہ ہم اپنے ملک، سماج اور معاشرے کی ضرورت بن جائیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً بیس کروڑ ہے، اس کے باوجود وہ سیاسی طور پر کمزور ہیں۔ سیاست میں ان کی نمائندگی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اکثر وہ دوسرے طبقات کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی بے وزنی کی کئی وجوہات ہیں، جن میں ان کا داخلی انتشار، قیادت کی کمی اور سیاسی بیداری کا فقدان شامل ہیں۔ مسلمانوں کو سیاست میں اپنی اہمیت کو سمجھنا ہوگا۔ انھیں ووٹ کے صحیح استعمال کی حکمت عملی اپنانی چاہیے اور ایسے امیدواروں کو منتخب کرنا چاہیے جو واقعی ان کے مسائل کو حل کرنے کی استعداد وصلاحیت رکھتے ہوں۔ مسلمانوں کو اپنی سیاسی قیادت خود پیدا کرنی ہوگی ورنہ بقول اقبالؔ ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو! تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہاں علامہ اقبال کی مراد ہندوستانی مسلمان ہیں جن کی قیادت موجودہ سیاست میں یا تو غیر موثر ہے یا پھر وہ صرف چند افراد کے مفاد تک محدود ہے۔ نوجوانوں کو سیاست میں آگے آ کر قیادت سنبھالنی ہوگی۔ مسلمانوں کو صرف ایک مخصوص سیاسی پارٹی پر انحصار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ انھیں مختلف جماعتوں میں شامل ہو کر اپنی سیاسی قوت کو مضبوط کرنا چاہیے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کو کئی چیلنجز کا سامنا ہے، لیکن ان کے پاس ترقی کی راہیں بھی کھلی ہوئی ہیں۔ اگر مسلمان تعلیمی، معاشی اور سیاسی میدان میں بیداری اور محنت کے ساتھ آگے بڑھیں، تو اپنی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ سب سے ضروری چیز اتحاد، مثبت سوچ اور حکمت عملی ہے۔ صرف شکایت کرنے سے حالات نہیں بدلیں گے، بلکہ عملی جدوجہد اور مستقل مزاجی کے ذریعے ہی بہتر مستقبل کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنی کمزوریوں کو دور کریں اور ایک باوقار، تعلیم یافتہ اور خود کفیل قوم کے طور پر ابھریں۔

....

لیجیے! دیر سے ہی سہی 'فیضان ادب' کا رواں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں 'تحقیق وتنقید' کے ضمن میں کئی اہم مضامین شاملِ اشاعت ہیں جو قارئین کے ذوق کی تسکین کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔ ڈاکٹر محسن رضا رضوی نے بہار اردو اکادمی سے شائع ہوئے والے جریدے 'زبان وادب' کا اشاریہ (ابتدا سے ۱۹۹۹ء تک) بڑی جانفشانی سے تیار کیا اور راقم الحروف کی استدعا پر اسے 'فیضان ادب' میں شائع کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ حقیر اس کے تئیں ان کا تہ دل سے ممنون ہے۔ یہ اشاریہ 'نقش ہائے رنگ رنگ' کے تحت قسطوار شائع کیا جائے گا۔ رواں شمارے میں مضامین کا اشاریہ شامل ہے۔ 'طاق نسیاں' کے تحت انصاری عبدالرحمٰن کا 'فسادنامہ' پر ایک مضمون شامل ہے۔ امید ہے یہ شمارہ بھی قارئین کو پسند آئے گا۔

فیضان حیدر (معروفی)

ڈاکٹر رؤف خیرؔ
موتی محل، گول کنڈہ قلعہ، حیدر آباد۔ رابطہ نمبر:9440945645

مہاراجا چندولعل شاداں (بے حد) سیّاس: بادشہ گر

تلخیص:

مطالعے کے بعد ہم پر روشن ہوا کہ چندولعل 'راجا' تو نہیں تھے مگر سیاس بادشاہ گر تھے۔ چندولعل آصف جاہی سلطنت میں اس قدر دخیل تھے کہ جسے چاہے سرفراز کرنے کے جتن کر سکتے تھے اور جسے چاہے معتوب و بے دخل کر دیا کرتے تھے۔ انگریز ذمہ داروں تک بھی ان کی رسائی تھی۔ انگریز بھی ان کے ذریعے اپنا کام نکال لیا کرتے تھے۔ انھیں آلۂ کار بناتے تھے۔ چندولعل اور انگریز امدادِ باہمی پر عمل پیرا تھے۔ چندولعل دولتِ آصفیہ میں بظاہر پیش کار تھے مگر دراصل Defacto مدارالمہام کے فرائض بھی وہ انجام دیا کرتے تھے۔ ناصر الدولہ کو بھی سریر آرائے سلطنت بنانے میں چندولعل نے اہم حصہ (رول) ادا کیا۔ نتیجتاً ناصر الدولہ ان کے احسان مند تھے اور ان کی ہر اعتبار سے قدر کیا کرتے تھے۔

چندولعل شاداں پر لکھتے ہوئے انہی کی خودنوشت 'عشرت کدۂ آفاق' کو ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اصل ماخذ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کی دیگر تاریخوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ 'عشرت کدۂ آفاق' چندولعل نے فارسی میں لکھی تھی جس کا اردو ترجمہ راجا راجیشور راؤ نے کیا تھا۔ 'عشرت کدۂ آفاق' کی تصنیف ۱۲۳۴ھ میں ہوئی۔ چندولعل نے خود اپنے تعارف میں لکھا ہے کہ: ''ان کا وطنِ مالوف معروف آباد ہے۔ وہ قوم سے کھتری کے فرقہ مہرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا سلسلہ اکبر بادشاہ کے نورتن راجا ٹوڈرمل سے ملتا ہے جو خود بھی کھتری قوم کی مہرہ شاخ سے وابستہ تھے......''

کلیدی الفاظ:

وطنِ مالوف، مہ لقابائی چندا، معروف آباد، قوم کھتری، عشرت کدۂ آفاق، چندولعل سیاس بادشاہ گر۔

....

تاریخ شاہد ہے کہ کئی شخصیتیں پسِ پردہ رہ کر کارنامے انجام دیتی رہی ہیں۔ نظام سادس میر محبوب علی خان نہایت کم سنی میں تخت پر بٹھائے گئے تھے اور امور سلطنت سالار جنگ اول بہ حیثیت مختار الملک انجام دیا کرتے تھے۔ نظام سادس کے ہوش سنبھالنے کے باوجود ان کی رہنمائی سالار جنگ ہی فرمایا کرتے تھے کہ وہ ایک تجربہ کار سیاسی مدبر تھے۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔

چندولعل بھی ایسی ہی ایک سیاسی شخصیت کا نام ہے۔ ان کے بارے میں جاننے کے لیے انہی کی خودنوشت سوانح 'عشرت کدۂ آفاق' کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ فارسی سے جس کا اردو ترجمہ 'فرحت کدۂ آفاق' کے نام سے راجا راجیشور راؤ نے کیا۔ یہ دونوں کتابیں حیدرآباد ہی میں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے 'عشرت کدۂ آفاق' کا سنہ اشاعت ۱۲۳۴ھ متعین کیا ہے۔ اس کے علاوہ چندولعل کی زندگی پر روشنی ڈالنے والی کچھ اہم تاریخیں بھی ہیں جن کو کھنگال کر ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے حقائق برآمد کیے ہیں جیسے:

۱۔ منشی فیض اللہ کی نایاب تاریخ 'خزانۂ گوہر شاہوار' مخطوطہ، مخزونہ کتب خانۂ آصفیہ ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء حیدرآباد

۲۔ غلام حسین خان جوہر کی 'گلزارِ آصفیہ' (۱۲۶۰ھ)

۳۔ منشی قادر خان بیدری کی تاریخ آصف جاہی۔ ۱۲۶۸ھ (جو ۱۲۶۶ھ میں مکمل ہو چکی تھی۔)

۴۔ غلام امام خان ترین کی تاریخ رشید الدین خانی۔ ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۴ء

۵۔ مانک راؤ وٹھل راؤ کی 'بستان آصفیہ'

۶۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری کی 'محبوب الزمن'

۷۔ تذکرۂ شعرائے دکن

۸۔ میر منشی التفات حسین کی مرتبہ تاریخ نگارستانِ آصفی، سنہ تصنیف ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۵ء

۹۔ راجا مکھن لعل کی 'تاریخ یادگار مکھن لعل' ۱۲۴۲ھ جو چندولعل کی زندگی میں لکھی گئی تھی۔

آیئے 'چندولعل شاداں' پر دادِ تحقیق دینے والی معتبر و مستند و ثقہ ہستی ڈاکٹر ثمینہ شوکت کے بارے میں پہلے جاننے کی کوشش کریں۔

پروفیسر ثمینہ شوکت ۱۹ رجون ۱۹۳۶ء کو گلبرگہ میں پیدا ہوئیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی میٹرک کی سند میں ان کا سالِ پیدائش ۱۹۳۴ء درج ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم میٹرک تک گلبرگہ ہی میں ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ انھوں نے خانگی طور پر کامیاب کیا۔ ۱۹۵۲ء میں بی۔اے اور ۱۹۵۴ء میں ایم۔اے (اردو) عثمانیہ یونیورسٹی سے کامیاب کیا۔ ۱۹۶۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے 'مہاراجا چندولعل حیات اور

کارنامے' کے موضوع پر پروفیسر عبدالقادر سروری کے زیرِ نگرانی پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کے مذکورہ مقالے کے ممتحن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر رشید احمد صدیقی تھے۔اس کے زبانی امتحان (Viva) کے لیے پروفیسر گیان چند جین حیدرآباد تشریف لائے تھے۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا پی ایچ۔ڈی کا مذکورہ مقالہ دو حصوں میں شائع ہوا۔پہلا حصہ 'مہاراجا چندو لعل شاداں اور حیدرآباد کا سیاسی و سماجی پس منظر' ۱۹۷۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔اس مقالے کا دوسرا حصہ 'مہاراجا چندو لعل شاداں: حیات اور کارنامے' ۱۹۸۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔جس وقت ڈاکٹر ثمینہ شوکت حیدرآباد یونیورسٹی میں ریڈر ہو کر شعبۂ اردو میں خدمات انجام دے رہی تھیں، اتفاق سے اسی زمانے میں پروفیسر گیان چند جین کا بھی حیدرآباد یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ڈاکٹر ثمینہ شوکت کے اس مقالے کے پیش لفظ مورخہ ۱۱/اپریل ۱۹۷۹ء میں گیان چند جین نے بڑی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ انکشاف فرمایا:

> ''انھوں نے (ثمینہ شوکت) نے 'مثنوی لطف' ترتیب دے کر شائع کی۔میں اپنے ڈی لٹ کے مقالے 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' کو (کذا) اشاعت کے لیے انجمن ترقی اردو کو دے چکا تھا۔مسودہ واپس لے کر میں نے اس میں 'مثنوی لطف' کے تعارف کا اضافہ کیا۔۱۹۶۵ء میں جب میں جموں اردو یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر مقرر ہوا وہاں ایم۔اے کے نصاب میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا مرتبہ 'شکار نامہ گیسو دراز' شامل تھا۔برسوں اُسے پڑھانے کا اتفاق ہوا۔حسن اتفاق ایسا ہوا کہ مارچ ۱۹۷۹ء میں میں نئی مرکزی حیدرآباد یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر ہو کر آ گیا۔ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا پہلے ہی یہاں تقرر ہو چکا تھا۔اس طرح مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کی مسرت حاصل ہوئی۔''[۱]

پی ایچ۔ڈی کی تکمیل سے پہلے ہی عثمانیہ یونیورسٹی کے ویمنس کالج (کوٹھی) میں ثمینہ شوکت صاحبہ کا تقرر بہ حیثیت اردو لکچرر ۱۹۵۸ء میں ہو چکا تھا۔۱۹۶۹ء میں وہ ریڈر بن کر عثمانیہ یونیورسٹی منتقل ہو گئیں اور پھر ۱۹۷۹ء میں چھے زائد تدریجی اضافوں (Increments) کے ساتھ بطور ریڈر اردو، حیدرآباد یونیورسٹی میں تقرر عمل میں آیا جہاں ۱۹۸۴ء میں انھیں پروفیسر کے عہدے پر ترقی دی گئی اور وہ صدرِ شعبہ بن گئیں۔۱۹۹۴ء میں وہ وظیفہ حسنِ خدمت پر سبک دوش ہوئیں۔ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے افرادِ خاندان کے ساتھ رہنے کے لیے وہ ٹورنٹو کینڈا منتقل ہو گئیں۔

۱۸/فروری ۱۹۶۵ء کو ثمینہ شوکت کی شادی جناب سکندر توفیق سے ہوئی جو گورنمنٹ پالی ٹکنک کالج

میں انگریزی کے لکچرر تھے اور اردو کے شاعر تھے۔ سکندر توفیق ڈرامے بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ' کیا گھر نگر کیا خانقاہ' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

سکندر توفیق نے دکن کالج پونے سے صوتیات (Phonetics) میں ڈپلوما بھی کیا تھا۔' اردو کی ترسیلی لسانیات' میں وہ اپنی شریکِ حیات ثمینہ شوکت کے شریک مصنف (Co-writer) بھی رہے۔ سکندر توفیق خلاقانہ تجربے بھی کیا کرتے تھے چنانچہ انھوں نے سات مصرعوں کی نظم کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام ' سباعی' رکھا تھا۔ اس کے موجد و خاتم وہی ثابت ہوئے۔ یہ اختراعی سباعی ناکام تجربہ ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اپنے تحقیقی مقالے' مہاراجا چندو لعل شاداں اور حیدر آباد کا سیاسی و سماجی پس منظر' کا انتساب اس طرح کیا ہے۔ '' سکندر توفیق کے نام جو میرے رفیق زندگی ہی نہیں رفیقِ قلب و ذہن بھی ہیں۔'' (ثمینہ شوکت جون ۱۹۷۹ء) ڈاکٹر حبیب نثار کی اطلاع کے مطابق پروفیسر ثمینہ شوکت کا انتقال ٹورنٹو کینڈا میں ۲۰۱۶ء میں ہوا۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی تحقیق کا ایک شاہ کار' شکار نامہ' ہے جو حضرت خواجہ گیسو دراز کے اہم اردو رسالوں میں شامل ہے۔ کئی مخطوطات کے متن کو سامنے رکھ کر ۱۹۶۲ء میں مرتب کیا گیا ہے۔ جس کے بارے میں گیان چند جین نے کہا کہ جموں یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہونے کی وجہ سے وہ اسے اپنے طلبہ کو پڑھاتے رہے ہیں جب وہ جموں میں اردو کے استاد تھے۔

۱۹۵۹ء ہی میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ممکنہ مآخذ کے حوالوں سے مہ لقا بائی چندا کو اردو کی اولین صاحبِ دیوان شاعرہ ثابت کیا تھا۔ مہ لقا بائی ایک حسین طوائف تھی اور چندو لعل کی بھی منظورِ نظر تھی۔ چندو لعل اس پر کافی مہربان تھے۔ دونوں کے مابین کافی بے تکلفی بھی تھی۔ درگا پرشاد نادِر نے' تذکرۃ النسا' میں ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے ان دونوں کے' تعلقات' پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> '' ایک روز راجا (چندو لعل شاداں) صاحب نے صبح کے وقت اس کی (مہ لقا) طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔
>
> ہے چین کہاں جب سے مری آنکھ لڑی ہے　　ملنے کی نجومی تو بتا کون گھڑی ہے
>
> اس شوخ دیدہ و دہن دریدہ حاضر جواب نے فوراً یہ شعر فی البدیہہ موزوں کر کے سنایا۔
>
> پہلے ہی سے چلا کے مرے دل کو ستا مت　　اے مرغِ سحر چپ رہ ابھی رات بڑی ہے''

اس سخن گسترانہ انداز سے اس طوائف کی بے باکی اور بے تکلفی ظاہر ہوتی ہے۔ ۱۹۵۹ء تک مہ لقا بائی چندا ہی کے سر اولین صاحبِ دیوان شاعرہ ہونے کا سہرا باندھا جاتا رہا ہے۔ بعد کی تحقیق میں اسد علی خان تمنا کی بیگم لطف النسا پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ قرار پائیں۔ لطف النسا امتیاز نے اپنے دیوان

کے آخر میں اس کے ترتیب پانے کی تاریخ بھی خود موزوں کی ہے۔

چوں از کنیز حضرتِ خاتوں دریں زماں — اشعارِ تازہ جمع تہہ دل شگفتہ شد
از روے ''یمن'' سالِ ہمایونِ ایں کتاب — ''دیوانِ امتیاز بخوانید'' گفتہ شد

'دیوانِ امتیاز بخوانید' کے اعداد ۱۲۰۳ ہوتے ہیں ان میں روے یمن یعنی (ی) کے دس عدد جمع کرلیں تو ۱۲۱۳ھ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ اس طرح امتیاز کا دیوان ۱۲۱۳ھ میں اور مہ لقا بائی چندا کا دیوان ۱۲۱۴ھ میں منظر عام پر آیا تھا۔[۲]

۱۹۶۲ء ہی میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے 'مثنوی لطف' اور 'حیات لطف' دو کارنامے انجام دیئے جن کی اہمیت کا اندازہ پروفیسر گیان چند جین کے اس اعلیٰ ظرفی کے مظاہرے سے ہوتا ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی تحقیق 'مثنوی لطف' کو اپنے چھپنے والے ڈی لٹ کے مقالے 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' کا حصہ بنالیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی تحقیقی کتاب 'حیات لطف' بھی آئی جس میں مرزا علی لطف کے کوائف اور ان کے فکر وفن کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے بڑی عرق ریزی سے تلاش کر کے لطف کی مثنوی اور مخطوطہ دیوان کے ساتھ ساتھ ممکنہ مآخذ سے لطف کا کلام اخذ کر کے لطف کی حیات اور کارناموں پر سیر حاصل مقدمے کے ساتھ کلیاتِ لطف بھی ۱۹۶۲ء میں مرتب کیا۔ ۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے 'دیوانِ لطف' بھی مدون کیا جس میں مرزا علی لطف کی غزلیات، قصائد اور دیگر اصنافِ کلام لطف جمع کر کے کارنامہ انجام دیا۔

مرزا علی لطف کے فکر وفن پر ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی دادِ تحقیق میں ان کے استاد پروفیسر عبدالقادر سروری کے بے پایاں لطف کا یقیناً دخل ہے جس نے سدِّ سکندری بھی پار کر لی تھی۔ چندو سے چندا تک یہ بے پایاں لطف برقرار رہا ہے۔ مرزا علی لطف پر اتنا کچھ مواد حاصل ہونے کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ عثمانیہ یونیورسٹی سے مرزا اکبر علی بیگ نے 'مرزا علی لطف حیات اور کارنامے' پر پی ایچ ڈی کر لی۔ مشاہیر نے ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی مرزا علی لطف پر دادِ تحقیق کی کھل کر داد دی، اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے خط مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۲ء میں فرمایا:

> ''آپ کی بھیجی ہوئی کتاب 'مثنوی لطف' بہت پسند آئی اور آپ کی محنت کا اندازہ کر کے خوشی ہوئی۔ امید ہے کہ ہر ایک پڑھنے والے کو یہ کتاب پسند آئے گی۔ خدا آپ کو مبارک کرے۔ مخلص ذاکر حسین''

پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی، ڈین شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ایڈیٹر 'برہان' دہلی نے یوں

تبصرہ فرمایا:

''مرزا علی لطف کا دیوان اور ان کی مثنویاں گوشۂ گم نامی میں پڑی ہوئی تھیں اور ان کے حالات کا بھی کچھ ایسا علم نہیں تھا۔ محترمہ ثمینہ شوکت جنھوں نے لطف کے کلیات کو جس میں دیوان بھی ہے اور مثنوی بھی، بڑی محنت سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔''

ڈاکٹر مسعود حسین خان فرماتے ہیں:

''مثنوی لطف کے لیے ادارۂ تحقیقات کا بہت ممنون ہوں۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ذاتی طور پر 'لطف' کیا ہے۔ انھیں تحقیقی کام کرنے کا بہت سلیقہ ہے بلکہ سگھڑپن معلوم ہوتا ہے۔ حالات اور متن کی تدوین بڑے اچھے انداز میں کی گئی ہے۔''

پروفیسر ہارون خان شروانی ایم ایل سی، سابق صدر شعبۂ تاریخ و سیاست و صدر (دہلی کالج، دہلی) کی رائے بھی سند کا درجہ رکھتی ہے۔ لطفؔ کے نام اور اس کی مثنوی سے بہت کم لوگ آشنا تھے۔ فاضل مولفہ نے حیدرآباد کے دو اور علی گڑھ اور رام پور کے ایک ایک نسخے کا تن دہی سے مطالعہ کیا ہے اور ساتھ ہی کم و بیش ایک سو صفحے کی تمہید کے ذریعے اردو پریمیوں کو لطفؔ اور ان کے زمانے کے ماحول سے دو چار کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر اے سی شرما، صدر شعبۂ اردو و فارسی، جبل پور یونیورسٹی فرماتے ہیں:

''مثنوی لطف' موسوم بہ 'نیرنگ عشق' اردو ادب اور تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ جدید اضافے نے دیرینہ ادبی و تاریخی کمی کو پورا کیا ہے۔ یہ ادبی قوتِ تخلیق اور ناقدانہ نگاہ پر شاہد ہے۔ میری رائے میں اس مثنوی کا درس گاہوں کے نصاب میں شامل کرنا حق بجانب ہوگا۔ مجھے قوی امید ہے کہ اس مستند نسخے کو اربابِ ذوق و شوق ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔''

محترمہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت صاحبہ نے 'مہاراجا چندو لعل شاداں اور حیدرآباد کا سیاسی و سماجی پس منظر' کے عنوان سے جو دادِ تحقیق دی ہے وہ بھی اپنی جگہ دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ چھے سو صفحات پر پھیلی ہوئی ان کی یہ معرکہ آرا کتاب ۱۹۷۹ء میں اردو اکاڈمی آندھرا پردیش (موجودہ تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈمی) اور ایچ ای ایچ دی نظامس ٹرسٹ حیدرآباد کے رقمی تعاون سے منظر عام پر آئی۔ سید منظور محی الدین کی کتابت کی مرہون منّت یہ کتاب نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد کے زیر اہتمام لیتھو پر شائع ہوئی ہے۔ کاغذ بہت معمولی ہے اور اس تحقیقی کتاب کے شایانِ شان نہیں۔ چھے سو صفحے پر مشتمل اس اہم کتاب کی قیمت صرف پینسٹھ روپے پچاس پیسے ہے۔ چندو لعل شاداں کے تعلق سے اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر گیان چند جین نے بڑی بے باکی سے فرمایا:

''مصنفہ سے خائف ہوئے بغیر میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ چندولعل کوئی بڑے شاعر نہ تھے۔ان کی بنیادی اہمیت ریاستی مدارالمہام کی ہے۔ادب میں ہم انھیں شاعر سے زیادہ شاعروں کے مربی کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔''

اس کتاب کے مطالعے کے بعد ہم پر روشن ہوا کہ چندولعل 'راجا' تو نہیں تھے مگر سیاس بادشاہ گر تھے۔چندولعل آصف جاہی سلطنت میں اس قدر دخیل تھے کہ جسے چاہے سرفراز کرنے کے جتن کر سکتے تھے اور جسے چاہے معتوب و بے دخل کر دیا کرتے تھے۔انگریز ذمہ داروں تک بھی ان کی رسائی تھی۔انگریز بھی ان کے ذریعے اپنا کام نکال لیا کرتے تھے۔انھیں آلۂ کار بناتے تھے۔چندولعل اور انگریز امدادِ باہمی پر عمل پیرا تھے۔چندولعل دولتِ آصفیہ میں بظاہر پیش کار تھے مگر دراصل Defacto مدارالمہام کے فرائض بھی وہ انجام دیا کرتے تھے۔ناصرالدولہ کو بھی سریر آرائے سلطنت بنانے میں چندولعل نے اہم حصہ (رول) ادا کیا نتیجتاً ناصرالدولہ ان کے احسان مند تھے اور ان کی ہر اعتبار سے قدر کیا کرتے تھے۔

چندولعل شاداں پر لکھتے ہوئے انہی کی خودنوشت 'عشرت کدۂ آفاق' کو ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اصل ماخذ بنایا ہے۔اس کے علاوہ اس دور کی دیگر تاریخوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔'عشرت کدۂ آفاق' چندولعل نے فارسی میں لکھی تھی جس کا اردو ترجمہ راجا راجیشور راؤ نے کیا تھا۔'عشرت کدۂ آفاق' کی تصنیف ۱۲۳۴ھ میں ہوئی۔چندولعل نے خود اپنے تعارف میں کہا:

''ان کا وطنِ مالوف معروف آباد ہے۔وہ قوم سے کھتری کے فرقہ مہرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کا سلسلہ اکبر بادشاہ کے نورتن راجا ٹوڈرمل سے ملتا ہے جو خود بھی کھتری قوم کی مہرہ شاخ سے وابستہ تھے......''

اس دور کی دیگر تاریخوں نے بھی اس پر صاد کیا۔ظاہر ہے چندولعل کے اثر و رسوخ کے سبب بے چون و چرا تاریخی نسب مان لینے میں ہی عافیت تھی۔جہاں تک سلسلہ نسب کا معاملہ ہے ہمارے اکثر ادیب و شاعر جب ذرا کسی قابل ہو جاتے ہیں تو پھر بڑی بڑی ہستیوں سے وابستگی دکھاتے ہیں۔بیشتر کے آباو اجداد ایران، توران، بغداد، عراق وغیرہ سے ہندوستان آئے ہوئے ہوتے ہیں یا پھر پیرانِ پیر سے اپنا سلسلہ نسب قائم کرتے ہیں۔میر محبوب علی بادشاہ نظامِ سادس کے ایما پر پیرانِ پیر کے خاندان کے ایک فرد سید عبدالرزاق کو حیدرآباد مدعو کیا گیا اور بادشاہ کے ساتھ ساتھ بیشتر درباری عبدالقادر جیلانی کے سلسلے سے وابستہ ہو کر قادری ہو گئے تھے۔تاریخی عمارت چار مینار میں پیرانِ پیر کا اولین چلہ قائم کیا گیا اور ہر سال گیارھویں کے موقع پر دفتر امور مذہبی کے زیر اہتمام گیارہ دیگ بریانی چار مینار لا کر تقسیم کی جاتی تھی جسے

غریب عوام اپنی بھوک مٹانے کے لیے اور خواص بہ طور تبرک حاصل کرتے تھے۔[۳]

محمد شبلی 'سیرۃ النعمان' لکھنے کے بعد عقیدتاً شبلی نعمانی ہو گئے۔ انھوں نے انکسار سے کام لیا کہ ایک تابعی سے نسبت پر قناعت کر لی ورنہ وہ آسانی سے 'فاروقی' بھی ہو سکتے تھے کہ انھوں نے امیر المومنین حضرت عمر فاروق کی سیرت 'الفاروق' بھی تو لکھی تھی جو عشرۂ مبشرہ میں تھے اور رسول اللہؐ کے خسر بھی تھے جن کا شمار خلفائے راشدین میں ہوتا ہے۔

چندو لعل نے اپنی خود نوشت میں اپنا سلسلہ راجا ٹوڈر مل سے جوڑا تھا لیکن انھی کے دور کے معتبر، مستند مورخ منشی فیض اللہ نے اپنی تاریخ 'خزانۂ گوہر شاہوار' میں اس تعلق کو رد کرتے ہوئے بے باکانہ لکھا:

''می گویند ایں اظہار را ہیچ اصل نیست۔''

اس دور کے ایک اور مورخ التفات حسین نے اپنی مرتبہ تاریخ 'نگارستانِ آصفی' (سنہ اشاعت ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۵ء) میں دولتِ آصفیہ کے ہندو اعیان و ارکان کا تذکرہ کرتے ہوئے سب سے پہلے راجا چندو لعل کا حال لکھا ہے لیکن وہ ٹوڈر مل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے۔ البتہ انھوں نے چندو لعل کا سلسلۂ نسب راجا مول چند سے شمار کیا ہے جو محمد شاہ کے عہد میں حیدر آباد آئے تھے۔

چندو لعل کی زندگی ہی میں لکھی ہوئی ایک اہم تاریخ 'تاریخ یادگار مکھن لعل' میں بھی (جو ۱۲۴۲ھ میں لکھی گئی تھی) چندو لعل کا ٹوڈر مل سے کوئی تعلق نہیں دکھایا گیا۔ یہ بات اتنی اہم نہیں کہ چندو لعل کا سلسلہ نسب کہاں تک جاتا ہے بلکہ یہ اہم ہے کہ خود چندو لعل کیا تھے۔

چندو لعل کی ولادت کا سنہ ان کی خود نوشت 'عشرت کدۂ آفاق' میں درج نہیں ہے۔ تذکرہ نگار پادری رجب علی ان کا سنہ پیدائش ۱۱۷۵ھ بتاتا ہے۔ 'بستانِ آصفیہ' (مرتبہ: ۱۳۴۴ھ) میں مورخ مانک راؤ وٹھل راؤ نے لکھا کہ:

''آپ (چندو لعل) رائے نرائن داس کے بیٹے تھے۔ سنہ ۱۱۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔''

معتبر و مستند مورخ عبدالجبار خاں ملکاپوری واحد شخص ہیں جنھوں نے چندو لعل کی پیدائش کا سنہ ۱۱۷۹ھ بتایا ہے۔ یہی قرین قیاس ہے۔ عبدالجبار ملکاپوری کی تحقیق کے مطابق چندو لعل کی پیدائش برہان پور میں ہوئی۔ چندو لعل کی عمر ابھی دس برس ہی کی تھی کہ ان کے والد کا سایۂ عاطفت ان کے سر سے اٹھ گیا۔ ان کے بھائی گووند بخش کے ساتھ چندو لعل کی پرورش بھی ان کے چچا مانک رام نے کی۔

چندو لعل کی شادی برہان پور میں وٹھل راؤ کی لڑکی سے ہوئی جو دولت راؤ سندھیا کے ملازم تھے۔ منشی التفات حسین اور مکھن لعل جیسے معتبر مورخین نے بھی اس شادی کا ذکر کیا ہے، جس سے چندو لعل کے دو

بیٹے بالا پرشاد اور نرائن پرشاد المعروف نریندر بہادر پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ چندو لعل کی ایک خواص کے بطن سے نانک بخش ہوئے تھے۔

چندو لعل اپنے بیٹے بالا پرشاد کی تعلیم و تربیت پر کافی توجہ دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ دولتِ آصفیہ میں اعلیٰ منصب یعنی پیش کار ہوجائے مگر ان کا یہ خواب پورا نہ ہوسکا۔ دوسرے بیٹے نرائن پرشاد المعروف نریندر بہادر کے تعلق سے انہی کے نواسے کشن پرشاد (شاد) لکھتے ہیں کہ نریندر بہادر نے سلطان علی شاہ سے بیعت کرلی تھی، ڈاڑھی رکھ لی تھی اور اپنے استاد عبدالکریم شہید کے اثر سے ان کا رجحان اسلام کی طرف زیادہ تھا مگر سربراہِ مملکت ناصر الدولہ نے انھیں ان حرکتوں سے باز رکھا۔ ورنہ ممکن تھا کہ وہ اسلام قبول کرلیتے۔ خود کشن پرشاد شاؔد کو بھی صوفیانہ عقائد سے خاص دلچسپی ہوگئی تھی وہ بھی خواجہ حسن نظامی کے زیر اثر آ گئے تھے۔ ان کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ نظام نے انھیں بھی تبدیلی مذہب کے اقدام سے روکا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

چندو لعل کے چچا 'نانک رام بھی دولتِ آصفیہ سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ تھے۔ چندو لعل کا تعلق بعض اہم عمائدینِ سلطنت سے تھا جیسے میر عالم، شمس الامرا۔ چندو لعل کروڑ گیری کی خدمت پر مامور تھے۔ انھوں نے ریاست کے کچھ علاقے انگریزوں کے حوالے کردیئے مگر محاسبے میں ماخوذ ہوکر گرفتار کرلیے گئے اور پھر جلد رہا کردیئے گئے۔ اُدھر انگریزوں نے بھی انھیں ہمدرد جانا اور ان کی مدد کرنے پر آمادہ رہے کیوں کہ انھیں ریاست میں ایک ایسا آدمی تو چاہیے تھا جو ان کے کام آسکے۔

ریاست کے ایک فرماں روا نظام علی خان تھے جن کے انتقال پر ان کے فرزند سکندر جاہ مسند نشین ہوئے۔ میر عالم وکیل سلطنت تھے اور چندو لعل پر بھی مہربان تھے دیوانی پر مامور ارسطو جاہ کا انتقال ہوگیا تو میر عالم دیوان ہوگئے جنھیں انگریزوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ میر عالم نے سکندر جاہ سے سفارش کرکے چندو لعل کو پیش کار مقرر کروایا۔

چندو لعل کے پیش کاری پر مامور ہونے کے دو سال کے اندر اندر ہی سنہ ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء میں میر عالم کا انتقال ہوگیا۔ اس عرصے میں چندو لعل سارے امورِ سلطنت میں دخیل ہوگئے تھے حتیٰ کہ نظام بھی ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرتا تھا۔ میر عالم کے انتقال کی خبر جیسے ہی نظام (سکندر جاہ) کو ملی انھوں نے چندو لعل کو مشورہ طلب کرنے کے لیے بلا بھیجا۔ 'عشرت کدۂ آفاق' کی رو سے چندو لعل نے میر عالم کے گزر جانے کی اطلاع انگریز ریذیڈنٹ کو دی اور ان کی جانشینی کے لیے مشورہ طلب کیا۔ انگریزوں کو بھی ملال ہوا کیوں کہ میر عالم انگریزوں کے طرف دار تھے۔ چندو لعل نے بھی انگریزوں سے ایسی وفاداری

دکھائی تھی کہ انگریز ریذیڈنٹ نے امورِ سلطنت میں اہم ذمہ داریاں چندولعل کو سونپنے پر سکندر جاہ کو مجبور کیا چنانچہ طے پایا کہ میر عالم کے داماد منیر الملک (میر عالم کی جگہ) دیوان مقرر ہوں اور چندولعل حسبِ سابق پیش کار رہیں لیکن ساتھ ساتھ یہ تصفیہ بھی ہوا کہ نظم و نسق کے سارے اختیارات منیر الملک کی بجائے چندولعل کے ہاتھ میں رہیں گے۔ اس طرح ایک راضی نامہ (Agreement) مرتب ہوا جس پر منیر الملک کے دستخط لیے گئے۔ (یہ تفصیلات عشرت کدۂ آفاق میں درج ہیں) اس طرح چندولعل بظاہر پیش کار تھے مگر دیوان (وزیر اعظم) بنے ہوئے تھے۔

اس کتاب کے مطالعے سے ایک اہم انکشاف سامنے آیا ہے کہ سکندر جاہ تو انگریزوں کے زیر اثر حکومت چلا رہے تھے جن کے دیوان (میر عالم ہوں کہ ان کے داماد منیر الملک) اور پیش کار (چندولعل) سب انگریزوں کی صواب دید پر زندہ تھے مگر سکندر جاہ کے ایک فرزند مبارز الدولہ ایک ایسے جیالے تھے جو انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ وہ وہابی تحریک سے متاثر تھے اور ہندوستان کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد دیکھنے کے آرزومند تھے۔ اگر یہ فرماں روائے دکن ہوتے تو ٹیپو سلطان کی یقیناً ہر طرح کی مدد کرتے اور بہت ممکن تھا کہ تاریخ ایک نیا موڑ لیتی۔ ہر سلطنت میں جعفر و صادق پیدا ہوئے ہیں۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

چنانچہ اپنے بیٹے مبارز الدولہ کو سکندر جاہ نے قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند رکھا تا کہ انگریز ان پر ہاتھ نہ ڈال سکیں۔ اس حکمتِ عملی کے پیچھے چندولعل کا ہاتھ ہے۔ اس طرح چندولعل نے نمک خوارِ نظام ہونے کا ثبوت دیا۔ تقریباً دو سال تک مبارز الدولہ قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند رہے۔ اس عرصے میں ریذیڈنٹ رسل سبک دوش ہو کر چلا گیا اور پھر چندولعل نے حکمت عملی سے کام لے کر ۱۲۳۵ھ میں مبارز الدولہ کو شہر بلوالیا۔ چندولعل کی اس وفاداری سے نظام سکندر جاہ بہت خوش ہوئے اور انھیں 'مہاراجا' کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

چندولعل کی حکمتِ عملی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ امام مہدی کے ظہور و فضائل کے بارے میں مہدویوں اور اہلِ سنت مسلمانوں میں گرما گرم بحث ہوگئی جس کے نتیجے میں دونوں طرف کے کئی لوگ مارے گئے۔ پھر ۱۲۳۸ھ میں فریقین کے مابین فساد ہوا اور حیدرآباد کشت و خون کی آماج گاہ بن گیا۔ سکندر جاہ کے کئی عمائدین جو بازوئے دولت اور جاں نثارانِ سرکار مانے جاتے تھے، اس بلوے میں مارے گئے۔ اس پر سکندر جاہ کو مہدویوں پر اس قدر غصہ آیا کہ چندولعل کو طلب کر کے حکم دیا کہ انگریز جمعیت کی مدد سے صبح ہونے سے پہلے چنچل گوڑے کی بستی کو ویران کر دیا جائے۔ چندولعل کے لیے پھر ایک

نازک صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی۔ وہ خود مہدویوں کی بستی میں گئے اور پر اثر تقریر کی اور ادھر سکندر جاہ کے دربار میں حاضر ہوکر مہدویوں کی طرف سے اس انداز میں رحم کی التجا کی کہ نظام سکندر جاہ کا دل پسیج گیا اور قتل عام کی سنگین سزا کی بجائے سکندر جاہ نے مہدویوں کی جلاوطنی کا حکم دیا۔ چنانچہ تین دن کے اندر اندر سارا محلہ اور شہر مہدویوں سے خالی کرادیا گیا۔ اس طرح چندولعل کی مہربانی سے مہدویوں کی جانیں بچ گئیں۔ اس کے بعد موقع دیکھ کر سکندر جاہ کی اجازت سے ان کی باز آبادکاری میں بھی مہاراجا چندولعل کی حکمت عملی کا دخل رہا۔ اس طرح تمام مہدوی چندولعل کے احسان مند ہوکر وفادار ٹھہرے۔

مہاراجا چندولعل کو عمارتیں بنوانے اور باغات لگوانے کا بھی شوق تھا۔ انھوں نے شہر میں پختہ سڑکیں بھی بنوائیں۔ حیدرآباد قلبِ شہر میں اپنے نام سے مہاراج گنج بنوایا جو آج بھی موجود ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ سے بہنے والی موسیٰ ندی پر ایک پل تعمیر کیا جو نئے پل کے نام سے آج بھی موسوم ہے۔ ان کے علاوہ بارہ دری بنوائی جو آج بھی چندولعل بارہ دری کہلاتی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ قائم محل، محل سرا، بہجت محل، آئینہ خانہ یا آئینہ محل، چینی خانہ اور تصویر خانہ قابل ذکر ہیں۔ آئینہ خانہ دراصل اربابِ نشاط کے لیے ایک مقام تفریح شمار ہوتا تھا جس میں رقص وسرود کی محفلیں بھی سجا کرتی تھیں۔ عید، برات اور دسہرے کے موقع پر اس آئینہ خانہ کی سجاوٹ دیکھنے لائق ہوا کرتی تھی۔ کوہِ مولا کی عمارت درگاہِ معلیٰ کا نقار خانہ، الوال کا مندر، ناندیڑ کا گردوارہ وغیرہ چندولعل کی یادگار ہیں۔ طوائف مہ لقابائی چندا پر چندولعل خاص طور پر مہربان تھے۔ اس کے لیے مولاعلی کے پہاڑ کے دامن میں قطعہ زمین عطا کیا گیا جہاں آج بھی خوب صورت مہ لقابائی کا خوب صورت مزار ہے جس کی خاطر خواہ دیکھ ریکھ نہیں ہورہی ہے۔

چار پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ مہ لقابائی چندا پر انگریزی میں ایک کتاب کی رسم اجرا ساہتیہ اکاڈمی کے چیرمین ڈاکٹر چندر شیکھر کے ہاتھوں مہ لقابائی چندا کے مزار کے اطراف لگائے ہوئے باغ میں ہوئی، جس میں ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب (لندن) مہمانِ خصوصی تھے۔ راقم الحروف (رؤف خیر) اور مضطر مجاز بھی اس محفل میں شریک تھے۔ محمود الحسن نے اس کی رپورٹنگ کی تھی۔

چندولعل بارہ دری کے اطراف میں دل کش باغ تھا جس کی تعمیر کے سنہ کا مادۂ تاریخ 'باغِ ارم' یا 'رام باغ' سے ۱۲۴۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہاں بھی عیش وعشرت کی محفلیں برپا کی جاتی تھیں۔ چندولعل کی مطلق العنانی کا یہ عالم تھا کہ شاہی خاندان کے افراد بھی چندولعل کی داروگیر سے بچ نہیں سکتے تھے۔ مورخ غلام امام خان ترینؔ نے سلیمان جاہ کا واقعہ درج کیا ہے۔ (یہاں ہم اس واقعے سے صرفِ نظر کرتے ہیں)

سکندر جاہ ۱۷/ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء کو انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے

بڑے بیٹے سیف الملک تفضّل علی میر بادشاہ تخت کے جائز وارث تھے اور مطمئن تھے کہ ان کی جانشینی تو طے ہے مگر چندو لعل نے فوج بھیج کر میر بادشاہ کو ان کے محل میں محصور و بے دست و پا کر دیا اور ان کی جگہ ناصر الدولہ کو تختِ شاہی پر بٹھا دیا گیا۔ اس کارروائی میں شمس الامرا نے بھی چندو لعل کا ساتھ دیا۔ ناصر الدولہ سکندر جاہ کے دوسرے بیٹے تھے۔ اس طرح ناصر الدولہ زندگی بھر چندو لعل کے احسان مند رہے اور چندو لعل نے بادشاہ گر کا رول ادا کیا۔ چندو لعل کو ناصر الدولہ نے خوب سرفراز کیا، یہاں تک کہ وہ ایک کروڑ روپیہ کا قرض بھی معاف کر دیا جو سکندر جاہ نے چندو لعل کو ۱۲۳۵ھ میں دیا تھا۔

ناصر الدولہ اپنی مسند نشینی کے بعد حیدر آباد میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے نالاں تھے، ادھر چندو لعل کی مطلق العنانی میں بھی انگریزوں کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔ تاہم وہ اپنی سیاسی مصلحت سے انگریزوں اور ناصر الدولہ دونوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ناصر الدولہ کے فرزند مبارز الدولہ انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے وہ چاہتے تھے کہ عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیں مگر سیّاس چندو لعل نے انگریزوں سے تعلقات بنائے رکھے تھے۔ چنانچہ بڑی ہوشیاری سے مبارز الدولہ کو قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند رکھا گیا۔ ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء میں دو سال بعد انھیں پھر باہر نکالا گیا۔ اس طرح ناصر الدولہ پر احسان جتا کر انھیں چندو لعل نے اپنا گرویدہ کر لیا اور کئی مراعات حاصل کر لیں۔ انھیں 'راجایانِ راجا' کے خطاب سے اور ان کے بیٹے بالا پرشاد کو راجا دھیراج کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

۱۲۴۸ھ کو منیر الملک کا انتقال ہوا جو برائے نام دیوان تھے اور سارے اختیارات تو چندو لعل کے ہاتھ میں تھے۔ ان کے مرنے کے بعد بھی یہ اختیارات چندو لعل کے ہاتھ میں حسبِ معمول رہے۔ بعض موقعوں پر تو چندو لعل نے خود کو دیوان بھی لکھا ہے کیوں کہ عملاً وہی دیوان تھے۔

ان کے دور کے مورخین نے چندو لعل کے شاطرانہ کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ چندو لعل نے ایک طرف تو نظام پر یہ رعب بٹھا دیا تھا کہ انگریز ان کی پشت پناہی کو ہر آڑے وقت میں تیار ہیں دوسری طرف انگریزوں کے ذہن میں یہ بات ڈال رکھی تھی کہ نظام ان سے بہت خوش ہیں۔ اپنی غیر موجودگی میں وہ ریذیڈنٹ کو بھی نظام سے ملنے نہیں دیتے تھے۔ ایک دور وہ بھی آیا کہ انگریز چاہتے تھے چندو لعل کو ان کے منصب سے ہٹا دیا جائے مگر ناصر الدولہ جانتے تھے کہ چندو لعل کو ہٹانا کوئی کھیل نہیں۔ بالآخر ۶ ستمبر ۱۸۴۳ء مطابق ۱۲۵۹ھ چندو لعل کو ہٹا دیا گیا اور چندو لعل کا تیس ہزار روپیہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔ چندو لعل کو حکومتِ برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری پر اور انگریزوں کی پشت پناہی پر جو بھروسا (Over Confidence) تھا وہ کچھ کام نہ آیا۔ آخر کار مایوس و نامراد چندو لعل شاداں کا

۷/ربیع الآخر ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۳/اپریل ۱۸۴۵ء کو منگل کے دن دیہانت ہو گیا۔ پرانے پل کے مرگھٹ میں ان کی لاش نذرِ آتش کی گئی۔

چندولعل شاداں کی سیّاس بادشاہ گر حیثیت پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ان کے کردار کے چند پہلوؤں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ چندولعل نجوم، رمل میں کامل یقین رکھتے تھے۔ خانگی و سرکاری معاملات میں وہ نجومیوں سے مشورہ کر کے قدم آگے بڑھاتے تھے۔ انھوں نے کئی نجومیوں کو اپنے یہاں ملازم رکھا تھا جیسے محمد شمس الدین خان اور بھوانی شنکر۔ چندولعل کو ناموری کا شوق تھا جس کے لیے وہ خیر و خیرات و داد و دہش سے کام لیا کرتے تھے۔ غلام امام خان ترین اور مکھن لعل نے اس پہلو پر کھل کر لکھا ہے۔ زندگی بھر وہ اپنی بساط سے زیادہ فیاضی و سخاوت کا مظاہرہ کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ لاکھوں روپیوں کے مقروض بھی رہے۔ وہ مالداروں، زمینداروں، منصب داروں، جاگیرداروں سے تاوان، جرمانے وصول کرتے تھے اور غریبوں کے ساتھ شاعروں، گانے بجانے والوں پر خوب خرچ کرتے تھے جیسے مہ لقابائی چندا طوائف وغیرہ پر۔ ایک بزرگ شاہ خاموش سے بھی چندولعل کو عقیدت تھی ان کی اولاد کو بھی نوازتے تھے۔ محرم کی عزاداری کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ عاشور خانوں میں علم ایستادہ کیے جاتے تھے۔ بسنت کا تہوار اور دسہرہ بھی اسی شان سے منایا جاتا تھا۔ ہندوؤں اور نام نہاد مسلمانوں کے تہوار مل جل کر منائے جاتے تھے۔ یہ سب نمائشی امور شوق و ذوق سے انجام دیئے جاتے تھے۔ ان کی زندگی کے حالات میں کہیں بھی یہ نہیں ملتا کہ ہندو مسلم بچوں کی تعلیم و تربیت کا انھوں نے کوئی انتظام کیا ہو۔ کہیں کوئی فیکٹری کھولی ہو جہاں کوئی تعمیری پروجیکٹ بروئے کار لایا جاتا ہو اور جہاں سے غریبوں کے لیے روزگار مہیا ہوتا ہو۔ البتہ کہیں آتے جاتے خیرات کے نام پر کچھ روپے پیسے لٹائے جاتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ کہانی بھی پھیلائی گئی ہے کہ روزانہ صبح سویرے پوجا پاٹ کے بعد مندر سے لوٹتے ہوئے دو ہزار روپے اور ہر منگل کو تین ہزار روپے خیرات کیے جاتے۔ اس طرح مورخوں نے ایسی بے سروپا کہانیوں کا رد کیا۔ ہر ہفتہ بارہ تیرہ ہزار روپیہ تو بڑے سے بڑا بادشاہ بھی نہیں لٹاتا تھا۔ اگر حساب جوڑا جائے تو مہینہ میں لاکھوں خرچ آئے گا جو چندولعل کی بساط سے بڑھ کر ہوتا۔

چندولعل اپنے افرادِ خاندان پر دل کھول کر خرچ کیا کرتے تھے۔ ان کے ایک ہی سگے بھائی راجا گووند بخش تھے۔ چچا نانک رام کے بیٹے لکھپت رائے تھے اور ایک رشتے کے بھائی راجا بال کشن تھے۔

چندولعل شاداں خود شاعر تھے ان کے حقیقی بھائی گووند بخش نے بھی فارسی میں ساڑھے پانچ ہزار اشعار کا ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا ہے جو 'دیوانِ ضیائی' کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے (اب تو کتب خانہ آصفیہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کہلاتا ہے اور اس میں اردو، عربی

وفارسی کتابیں بے ترتیب ڈھیر کی صورت میں پائی جاتی ہیں۔مخطوطات (Manuscripts) کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔)

ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی تحقیق کے مطابق گووند بخش کے دیوان ضیائی میں چھوٹے بڑے کل گیارہ قصائد ،نعت،منقبت وغیرہ ہیں۔ان کے علاوہ غزلیں اور ۳۲ر رباعیات اور ۱۴۰ر مستزاد بھی ہیں اور مثنویاں صرف تین ہیں۔انھیں تصوف سے لگاؤ تھا۔گووند بخش کا انتقال ۱۵ر رمضان ۱۲۵۰ھ میں اڑسٹھ برس کی عمر میں حیدرآباد میں ہوا۔

راجا چندولعل شاداں کے بیٹے راجا بالا پرشاد تھے جو ۱۲۱۹ھ میں پیدا ہوئے۔بالا پرشاد کے بیٹے تھے راجا نرائن پرشاد جو نریندر بہادر کے خطاب سے معروف تھے،جنھیں اسلام سے رغبت تھی۔ان کی نرینہ اولاد نہیں تھی صرف ایک ہی لڑکی تھی جو ہری کشن سے بیاہی گئی تھی جس کے بطن سے کشن پرشاد پیدا ہوئے جو آگے چل کر سر کشن پرشاد شادؔ کہلائے۔گویا کشن پرشاد،نرائن پرشاد المعروف نریندر بہادر کے نواسے تھے۔سر کشن پرشاد شادؔ کو علم وادب سے بہت شغف تھا وہ فارسی واردو میں شعر کہا کرتے تھے علامہ اقبال سے ان کے گہرے روابط تھے۔دونوں کے مابین جو مراسلت ہوئی ہے اسے منظر عام پر ڈاکٹر محی الدین قادری زور لا چکے ہیں،ملاحظہ ہو:'اقبال وشادؔ'

سر کشن پرشاد شاد علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے۔ان کی زمینوں میں شعر کہا کرتے تھے۔انہی کی طرح قطعات بھی لکھے۔ان کی بڑی خواہش تھی کہ اقبال ہائی کورٹ کے جج ہو کر حیدرآباد آجائیں۔اس کے لیے انھوں نے کوششیں بھی بہت کیں مگر سر اکبر حیدری اور انگریز نہیں چاہتے تھے کہ اقبال نظام کی حکومت میں کسی ذمہ دار عہدے پر مامور کیے جائیں۔[۴]

چوں کہ ہمارا مضمون چندولعل شاداں ہے اس لیے ہم ان کے شعر وادب سے لگاؤ اور خدمات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔یہ جب دس سال کے تھے کہ ان کے والد رائے نرائن داس کا انتقال ہو گیا۔چنانچہ ان کی اور ان کے بھائی گووند بخش کی تربیت ان کی ماں کے سایۂ عاطفت میں ہوئی مگر بعد میں ان کے چچا نانک رام کے حسنِ سلوک کا تذکرہ بھی چندولعل نے اپنی خودنوشت 'عشرت کدۂ آفاق' (فارسی) میں کیا۔عشرت کدۂ آفاق اور گووند بخش کے 'دیوان ضیائی' کے دیباچے سے پتہ چلتا ہے کہ نانک رام ان دونوں بچوں کو عنفوان شباب ہی میں 'تذکرۃ الاولیا' اور جامیؔ کی 'نفحات الانس' کے مطالب اور توحید کے مسائل سمجھایا کرتے تھے۔

ویسے گھر کے فرد کی گواہی نا قابلِ قبول ہوتی ہے تاہم بہ حالتِ مجبوری اس پر بھروسا کیا جاسکتا

ہے۔ سرکشن پرشاد (شاد) اپنی کتاب 'جذباتِ شادؔ' میں چندولعل کے ایک استاد سید غالب کا ذکر کرتے ہیں جو عربی و فارسی کے ماہر تھے۔ ان کے علاوہ ایک اور استاد سید زین العابدین ہمدم طباطبائی تھے جو شیراز سے حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ ایسے اساتذہ سے چندولعل نے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ شعر و ادب سے گہری وابستگی کا ثبوت یہ ہے کہ چندولعل حیدرآباد سے باہر کے شاعروں کو مدعو کیا کرتے تھے۔ لکھنؤ سے امام بخش ناسخ کو پہلے بارہ ہزار روپیہ پھر دوسری بار پندرہ ہزار روپیہ بھیج کر بلانا چاہتے تھے مگر ناسخ نے معذرت چاہ لی۔ دہلی سے شیخ ابراہیم ذوق کو مدعو کیا مگر انھوں نے بھی دلی سے باہر قدم نکالنا گوارا نہ کیا: ۔ع:

کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

البتہ شاہ نصیر دہلی سے دکن چلے آئے اور ایسے آئے کہ یہیں کی خاک میں سما گئے۔ مہ لقا بائی چندا کے حسن کا گرویدہ تو ایک عالم تھا۔ نظام دکن کے دیوان میر عالم نے تو دو سو بیس اشعار پر مشتمل ایک مثنوی 'سراپائے مہ لقا' ہی لکھ ڈالی۔ ان چند اشعار سے میر عالم کی فریفتگی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اے ماہِ سپہر آشنائی سر تا پائے تو دل رُبائی
اے مردم دیدۂ محبت سر تا قدمت طلسمِ الفت
اے ماہ لقائے ماہ پیکر اے ماہ جبین ماہ منظر
اے حسنِ تو در جہاں فسانہ دل گرمی عشق را بہانہ
من، جسم و جانِ من تو باشی ہم روحِ روانِ من تو باشی

کتب خانہ آصفیہ (موجودہ اسٹیٹ لائبریری) حیدرآباد میں مہ لقا بائی چندا کے دیوان کا مخطوطہ 'دیوانِ چندا' ہے جو راجا راؤ رنبھا کے ایما سے اس کی زندگی میں نصیر الدین نے ۱۲۲۰ھ میں مرتب کیا تھا جس میں مہ لقا بائی چندا کی ۹۸ رغزلیں ہیں۔ اس کے تقریباً ایک سو سال بعد غلام صمدانی خاں گوہرؔ نے مہ لقا کی مزید ستائیس ۲۷ رغزلوں کے اضافے کے بعد جملہ ۱۲۵ رغزلوں پر مشتمل دیوان ترتیب دیا ہے۔ مہ لقا بائی کی شہرت دکن سے شمال تک تھی۔ مہ لقا بائی چندا کی ایک غزل ہے۔

ہلالِ مہِ نو تو کم دیکھتے ہیں وہ ابرو کا تیرے جو خم دیکھتے ہیں

مرزا غالبؔ نے چندا کی اس زمین میں غزل کہی ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

چندولعل شاداں بھی مہ لقا بائی چندا کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر تھے۔ انھوں نے چندا کی بعض غزلوں کی زمینوں میں خود بھی غزلیں کہی ہیں۔

چنداؔ

ہم سے کرے ہے یار بیاں اپنی چاہ کا
حاضر ہیں ہم بھی گرہو ارادہ نباہ کا
ابرو کماں کو کھینچ لے گی اس طرف نظر
تب سے پڑا ہے کھٹلے میں ناوک نگاہ کا
اے یار بے خبر تجھے اب تک خبر نہیں
کب کا گزار ہوگیا کوچے میں ماہ کا ......

آپ گردن تو ہلا دیتے ہیں ہر بات کے وقت
یہ غضب ہے کہ مچل جاتے ہیں پھر گھات کے وقت
چشمِ بد دور بہم ہوتی ہیں کیا کیا چہلیں
بلکہ الفت کی ترقی ہے ملاقات کے وقت
کرکے چنداؔ تو جبیں سائی شہِ مرداں سے
مانگ لے دولتِ کونین عنایات کے وقت

چندولعل شاداںؔ

دیکھا میں شب کو چہرہ جو اس رشکِ ماہ کا
عالم ہوا کچھ اور ہی اپنی نگاہ کا
جس کی پلک حنان[۵] ہے اور ہے نگاہ تیر
ہووے کہاں مقابلہ اس سے سپاہ کا
اے یار جان و دل سے تجھے چاہتا ہوں میں
کیوں کر رہے نہ ناز مجھے تیری چاہ کا

ذکر میں عمر کٹی جن کی سدا رات کے وقت
پھول کیوں ان کے دہن سے نہ جھڑیں بات کے وقت
جیسے خورشید نکلنے سے جہاں ہو روشن
حظ یہ اٹھتا ہے ہمیں تیری ملاقات کے وقت
صبح افلاک پہ کہتے ہیں ملائک آمین
ہاتھ شاداںؔ جو اٹھاتا ہے مناجات کے وقت

مہ لقابائی چندا کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی غزل صرف پانچ اشعار کی ہوتی تھی اور کسی شعر میں یا مقطعے میں حضرت علی سے عقیدت کا اظہار ضرور کرتی ہے (انعام اللہ یقین کی ہر غزل بھی پانچ اشعار پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔) مہ لقابائی چندا کی وفات ۱۲۴۰ھ میں ہوئی۔ اس کا مزار کوہِ مولا علی کے دامن میں ہے۔ شمالی ہند سے حیدرآباد آنے والے شیخ محمد حفیظ دہلوی کو چندولعل نے ملک الشعرا بنا رکھا تھا اور اپنے کلام پر اُن سے اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ حفیظؔ کو مرزا علی لطفؔ سے عقیدت تھی۔

حفیظ الطاف ہے مرزا علیِ لطف کا مجھ پر
سبب یہ ہے کہ بندہ ہوں جنابِ شاہِ مرداں کا

اور حفیظ نے اس پر بھی اظہارِ مسرت کیا ہے کہ لطف نے ان کا کلام سن کر تعریف کی تھی۔

سنا جو لطفؔ نے فرمایا آفریں اس کو
حفیظؔ شعر بھی کہتا ہے اور سپاہی ہے

حفیظ کی زمینوں میں شاداںؔ کی غزلیں بھی ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ چندولعل شاداں نے سراج اورنگ آبادی، میرؔ و سوداؔ، شاہ نصیر، ناسخ، انشا، جرأت کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں اور چندولعل کی بعض شگفتہ زمینوں میں بعد کے اساتذہ نے جیسے مولانا حالیؔ اور فانیؔ نے غزلیں کہی ہیں۔ چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

سراجؔ اورنگ آبادی

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

چندولعل شاداںؔ

عجب ایک طرح سے گلے لپٹ سرشام سے وہ پری رہی
گئی شاخِ دل تھی جو خشک ہو، سو تمام عمر ہری رہی

میرؔ

سوزشِ دل سے مفت گلتے ہیں
داغ جیسے چراغ جلتے ہیں

چندولعل شاداںؔ

سیر کو آپ ہم جو چلتے ہیں
مدعی دیکھ دیکھ جلتے ہیں

چندولعل شاداںؔ

جو نقشِ دل ہوا وہ مٹایا نہ جائے گا
اس کو بھلایئے تو بھلایا نہ جائے گا
کیا دیکھیے دکھایئے گم عقل و ہوش ہیں
دیکھا جو ہم نے اس کو دکھایا نہ جائے گا

مولانا حالیؔ

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

چندولعل شاداں نہ صرف خود اچھے شاعر تھے بلکہ اچھے شاعروں کی پذیرائی میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔ بے شمار شاعروں کے وہ مربی تھے۔ کئی شاعروں نے ان کی شان میں قصیدے کہہ کر صلہ پایا۔ کتب خانہ سالار جنگ میں چندولعل کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدوں کا ایک مجموعہ محفوظ رہ گیا ہے جو 'مجموعۂ قصائد' کے نام سے موسوم ہے جس میں ہیں:

''اردو قصیدے ۔ ۳۵؛ اردو مسدس ۔ ۴؛ اردو مستزاد ۔ ۱؛ کبت ۔ ۱۰؛ قطعات ۔ ۹؛ فارسی قصائد ۔ ۶''

چند قصیدہ گو شاعروں کے نام اور تعارف بھی ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے دیا ہے جنھوں نے چندولعل کی شان میں قصیدے لکھے تھے۔ نمود، امیر، محوی، محمد مولا حسن، عیاں، عافیت طلب خاں، روپ نرائن ہوش، صحت طلب خاں شرر، رائے خوب چند، مرزا محمد، رائے کیول کشن، رائے چین رائے منشی، انور، مجرم، دلاور، خلیل اللہ خاں سحر، راجا مکھن لعل مکھن (جو بے لاگ تذکرہ نگار بھی ہیں)، شیر محمد خان ایماںؔ کے بھانجے محمد صدیق قیسؔ، غلام مصطفیٰ خاں سخنؔ (جو پچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی کے شاگرد تھے)، عابد علی بیگ ظہور، عباس علی خاں کافیؔ، غلام حسین خان جوہرؔ، غلام محی الدین خاں متینؔ، ان کے علاوہ شاہ نصیر نے بھی اک لمبی ردیف میں چندولعل شاداںؔ کا قصیدہ لکھا۔ ایک مسٹر لوئیس بھی قصیدہ گو تھے، ذوالفقار علی خان ایماؔ، رضا علی مرہونؔ، وزیر علی مسرتؔ، میر سجاد علی خان سجادؔ، مرزا محمد اعظم علی امیدؔ، غلام امان خان ترین، حافظ تاج الدین مشتاقؔ، قادر خان بیدری، امیر

بخش خان شہرت، شاہ خاموش کے دو بیٹے شاہ خاص اور طٰہٰ، خیر الدین فائق وغیرہ۔ بعض متوسلین اور شاعروں کی تنخواہیں چندولعل سے نہیں ملیں تو ان لوگوں نے ان کی ہجویں بھی لکھیں جیسے ایک شاعر کی رباعی ہے۔

کچھ ہے تو ہمارا، پاس عزت کیجے　　بندے کو خوشی سے رخصت کیجے
کچھ اور نہیں میں مانگتا ہوں مہاراج　　تنخواہ مری مجھ کو عنایت کیجے

ایسے کچھ شاعروں کو چندولعل سے شکایتیں تھیں۔ ان کے علاوہ مبارز الدولہ بھی چندولعل سے سخت نفرت کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ اس مضمون کی تیاری میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت کے پی ایچ ڈی کے مقالے 'مہاراجا چندولعل شاداں اور حیدرآباد کا سیاسی وسماجی پس منظر' سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے اور ثمینہ شوکت کی زندگی کے حالات ڈاکٹر شفیق احمد سے دستیاب ہوئے جنھوں نے ڈاکٹر ثمینہ شوکت کے فکر وفن پر دادِ تحقیق دی۔ ان کا مقالہ غیر مطبوعہ ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات وحواشی:

۱۔ مہاراجا چندولعل شاداں اور حیدرآباد کا سیاسی وسماجی پس منظر، ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد، ۱۹۷۹ء، پیش لفظ

۲۔ ملاحظہ ہو: عہد ارسطو جاہ: علمی وادبی خدمات، ڈاکٹر لئیق صلاح نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد، جنوری، ۱۹۸۶ء

۳۔ ملاحظہ ہو: حیدرآباد کی خانقاہیں، مطبوعہ ۱۹۹۴ء

۴۔ بحوالہ: اقبال اور حیدرآباد از نظر حیدرآبادی

۵۔ کمان کے بجائے حنان شاید کتابت کی غلطی ہے۔ خیرؔ

☆☆☆

ڈاکٹر اسما مسعود
ایسوسیٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈونگر کالج بیکانیر، رابطہ نمبر: 9461161891

رشید افروز کی شعری کائنات

تلخیص:
رشید افروز کی شاعری کی ابتدا ۱۹۶۲ء میں اس وقت ہوتی ہے جب اردو کے ادبی منظر نامے پر جدید شاعری کا تسلط تھا۔ نئے زمانے کی صنعتی اور مشینی زندگی، سکون کی تلاش میں سرگرداں انسان کا منتشر وجود، قدروں کا زوال اور انسان کی باطنی شکست اور کرب، جدید شاعری کے اہم موضوعات تھے، عصری زندگی کے تلخ حقائق اور ذاتی زندگی کے کرب نے ان کی شاعری میں احساسِ تنہائی، خواب اور ماضی کے یادداشتی اور محسوساتی پیکروں کو خاص جگہ دی ہے۔ ان کے یہاں رومانی جذبات خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ عصری حسیت رشید افروز کی شاعری کو نئے تجربات کے ذریعۂ معمہ بنانے کے بجائے اظہار کے ایسے سانچوں کی تلاش کرتے ہیں جن میں ترسیل کا حسن موجود ہے۔ آج کے انسان اور معاشرے کے انتشار کو واضح کرنے کے لیے وہ جدید لفظیات کے ساتھ روایتی الفاظ سے بھی تراکیب تراشتے ہیں لیکن جدید حسیت کے اظہار میں بھی فنی دل کشی کو ملحوظ رکھنا رشید افروز کی انفرادیت ہے۔

کلیدی الفاظ:
نیند، خواب، یاد، تنہائی، سناٹا، پتھر، ریت، غبار، وقت، انصاف، تیرگی، گھر، جنگل، ویرانی، بستی، خاک۔

رشید افروز کا تعلق احمد آباد گجرات سے ہے۔ ان کا اصل نام شیخ عبد الرشید ہے اور قلمی نام رشید افروز۔ رشید افروز کی پیدائش یکم اکتوبر ۱۹۴۵ء کو عبدالمقیم صاحب کے یہاں ہوئی۔ رشید افروز کی شاعری کی ابتدا ۱۹۶۲ء میں ہوئی، لیکن ۱۹۶۵ء تک کی تخلیقات انھوں نے منسوخ کر دیں۔ اشاعت کے لئے پہلی بار اپنی غزل ماہنامہ 'شب خون' الہ آباد کو ارسال کی۔ یہ غزل ماہنامہ 'شب خون' الہ آباد کے شمارہ نمبر ۸، جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ [۱] ان کا پہلا شعری مجموعہ 'نفی' ۱۹۸۰ء اور دوسرا مجموعہ 'نصاب' ۲۰۲۱ء میں شائع

ہوا۔رشید افروز کا ایک شعر ہے ۔

نئے جہاں کا نصاب لکھّوں ورق ورق اضطراب لکھّوں

رشید افروز کا یہ شعران کے شعری اور تخلیقی رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔رشید افروز کی شاعری کی ابتدا اس دور میں ہوتی ہے جب شعرا جدیدیت کا سہارا لے کر شاعری کی ڈگر پر چلنا فخر سمجھ رہے تھے۔جدید شاعری نے اپنے عہد کی پیچیدگیوں اور نئے دور کے انسان کی باطنی شکست وریخت اور کرب کی بھرپور ترجمانی کی۔نئے زمانے کی صنعتی اور مشینی زندگی نے انسان کے وجود کو منتشر کر دیا۔انسان کا منتشر وجود، قدروں کا زوال،ذات کی تلاش،سکون اور امن وامان کی تلاش میں سرگرداں انسان بدلتے ہوئے نظامِ زندگی کے وہ عطیات ہیں جن پر جدید شاعری کی عمارت تعمیر ہوئی۔کسی بھی شاعر یا ادیب کی ذہنی اور ادبی نشوونما میں اس کے عہد،سماج،ادبی رویوں اور اس کی ذاتی زندگی کے تجربات ومحسوسات کا گہرا ہاتھ ہوتا ہے۔رشید افروز کی شاعری ہم عصر حسیت کی ترجمان ہے۔وہ نئی زندگی کی پیچیدگیوں اور اپنے عصر کے انسان کے باطنی کرب کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں،لیکن لسانی توڑ پھوڑ سے اپنی شاعری کو معمہ نہیں بناتے۔رشید افروز ذاتی اور اجتماعی واردات وتجربات کے ساتھ تہذیبی اور اخلاقی زوال،معاشرتی تضادات،جذباتی ناآسودگی اور انسان کی بے بسی کو فنی وتخلیقی حسن کے ساتھ واضح کر دیتے ہیں۔

رشید افروز کی غزلوں اور نظموں میں خواب اور نیند کا پیکر بڑی توانائی کے ساتھ ابھرا ہے۔وہ خواب،بے خوابی اور نیند کی متعدد کیفیات کے ذریعہ انسانی محرومی،نارسائی اور زندگی کی جمالیاتی قدروں کو خوب صورتی سے واضح کر دیتے ہیں ۔

آنکھوں میں جھلملاتے رہے خواب رات بھر
چلتی رہی خیال کے صحرا میں گرم لُو

✪✪✪

آج پھر ہم کو نگاہوں سے گزرنا ہوگا
رات بیدار ہے خوابوں کی پذیرائی میں

✪✪✪

منحرف خواب سے آنکھیں ہیں سحر ہونے تک
چاند پھر جھیل کے اُس پار اُتر جائے گا

✪✪✪

تمام رات بہلتا رہا ہوں خوابوں سے

سحر ہوئی تو مجھے ڈس گیا مقدر دیکھ

✪✪✪

خیمۂ خواب سے کب اُس کا گزر ہوتا ہے
رات کا پچھلا پہر تنہا بسر ہوتا ہے

✪✪✪

اک ذرا دیر ابھی چین کی نیند آئی تھی
دے گیا پھر مجھے خوابوں کی امانت کوئی

✪✪✪

جاگی ہوئی آنکھوں میں کوئی خواب نہیں ہے
بس اتنی تمنا ہے ذرا دیر سلادے

۱۹۶۰ء کے آس پاس ابھرنے والی جدید شاعری نے اپنے عصر کے پیچیدہ مسائل اور نئے انسان کے باطنی کرب کو نمایاں کرنے کے لیے نئی لفظیات، تشبیہات، استعارات اور علامتوں کا سہارا لیا، اس سے بے شک شاعری کا دامن وسیع ہوا لیکن شعرا نے جس طرح اپنی لفظیات اور علامتوں کو معنیٰ پہنائے اس سے شاعری پر ابہام کے پردے پڑنے لگے۔ لیکن رشید افروز کی شاعری کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ نئی زندگی کی پیچیدگیوں اور اذیتوں کی ترجمانی مبہم اور پیچیدہ شعری اسلوب میں ہو یہ ضروری نہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ہماری شعری روایت کا فنی شعور رکھتے ہیں اور اظہار کے ایسے سانچوں کی تلاش کرتے ہیں جن میں ترسیل کا حسن موجود ہے۔ رشید افروز کی غزلیں کلاسیکی غزل کی خوبیوں کی آئینہ دار ہیں۔ مثلاً ان کی غزل کے یہ شعر دیکھیے ؎

آواز دے کے جانے کہاں چھپ گیا ہے تُو — خاموشیوں میں ڈوب گئی زندگی تمام

✪✪✪

راکھ کے ڈھیر نے وہ شعلہ چھپا رکھا ہے — چھوکے دیکھو تو ذرا انگلیاں لودے اٹھیں

رشید افروز کی نظم نگاری اور غزل گوئی کی اہم خوبی اختصار ہے۔ انھیں الفاظ کو سلیقے سے اور فنی چابک دستی کے ساتھ استعمال کرنے کا ہنر آتا ہے۔ اس لیے بے جا طوالت کے بجائے اختصار کے ساتھ اس طرح اپنی بات کہتے ہیں کہ اس میں تاثیر کا عنصر بہت بڑھ جاتا ہے۔ رشید افروز کی نظم 'درگزر' کے یہ اشعار دیکھیے ؎

تُو جانتا ہے/ یہ اندھیری رات مجھ پر کتنی بھاری تھی......!/ اے روز و شب کے خالق......!
/ جانتا ہے تُو/ یہ ساری رات مَیں نے جاگ کر کیسے گزاری ہے......!/نسیمِ صبح کے جھونکوں
سے/ میری جلتی آنکھوں میں/ ذرا سی دیر سونے کی تمنا جاگ اٹھی ہے......!/ مجھے ڈر

ہے............/ نمازِ صبح سے پہلے مبادا آنکھ لگ جائے......!!/ اگر کچھ دیر نیند آجائے تو یارب
درگزر کرنا......!!/ مِری بے نور آنکھوں میں/ سنہرے خواب بھر دینا......!!

رشید افروز کے یہاں یاد اور احساسِ تنہائی کا بیان کثرت سے ملتا ہے۔ یادیں اور ماضی کے خیالات انھیں تنہائی کے ایسے صحرا میں بھٹکنے پر مجبور کر دیتے ہیں جہاں احساسِ تنہائی، کرب اور تشنگی کا عالم ہے۔

یادوں کے جواں سال کھنڈر چیخ رہے ہیں
خوابوں کے جزیروں میں یہ طوفان سا کیوں ہے

✪✪✪

اب بھی اکثر میں اُسی پیڑ سے مل آتا ہوں
جس کے سایے میں ہوا تھا کبھی رخصت کوئی

✪✪✪

آگ روشن تھی کبھی سینے میں
صرف احساس ہے اب کچھ بھی نہیں

✪✪✪

تنہائیوں کے درد سے رستا ہوا لہو
دیوار و در اداس ہیں ہر شے ہے زرد رو

خاموشیوں میں ڈوب گئی زندگی تمام — آواز دے کے جانے کہاں چھپ گیا ہے تُو
آنکھوں میں جھلملاتے رہے خواب رات بھر — چلتی رہی خیال کے صحرا میں گرم لُو

غرض ان کے یہاں یادوں کی کتاب کے اوراق کھلتے جاتے ہیں اور وہ خوب صورت یادداشتی پیکروں کے سہارے ہمارے سامنے ماضی کو زندہ کر دیتے ہیں۔ رشید افروز کی نظم 'وہ دن خواب تھے یا کہانی' بھی یادوں کی تصویروں سے سجی ہوئی ہے۔

مجھے یاد ہیں ساری باتیں۔!/ وہ دِن خواب تھے یا کہانی/ مگر یاد ہیں ساری باتیں۔!/ سنہرے ہرن کے تعاقب میں/ اندھے سفر کی کہانی تھی یا خواب تھا/ مگر یاد ہے............!/ سفر میں اگر/ ریت سے کوڑیاں مل گئیں/ تو بہت خوش ہوئے............!!/ کبھی سرد جھونکا/ بدن چھو کے گزرا/ تو ایسا لگا......جیسے برسوں سے ٹھہرا ہوا/ زرد موسم بدل جائے گا......!/ اور بنجر زمیں سے نئی کونپلیں جنم لیں گی......!!/ مگر............بے سبب چلتے چلتے/ سبھی خواب مرجھا گئے............!/ ہمیں اب نہ پانے کی حسرت/ نہ کھونے کا دُکھ ہے............!/ زمانہ ہوا............/ اپنے

ہونے نہ ہونے کا/ احساس تک مٹ گیا ہے............!!(وہ دِن خواب تھے یا کہانی)

غزلوں اور نظم کے ان اشعار میں شاعر نے جو یادداشتی اور محسوساتی پیکر تخلیق کیے ہیں وہ شاعر کی اندرونی کیفیات کی تہ کھولنے کے ساتھ ساتھ حال سے عدم تسکین کی علامت بھی ہیں۔لیکن رشید افروز اپنی ذاتی اور شخصی زندگی کے دکھ کو عصری زندگی کے انسان کے باطنی کرب میں سمو دیتے ہیں۔اور ہمارے ذہن کو سوچ کا نیا زاویہ دے جاتے ہیں۔علقمہ شبلی نے رشید افروز کی نظم نگاری کے لیے بہت صحیح لکھا ہے:

''رشید افروز ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے زندگی کی مختلف کیفیات کا مطالعہ و مشاہدہ نہایت دِقتِ نظر سے کیا ہے اور پھر ان تجربات کو اپنی مختصر نظموں میں اس طرح منتقل کر دیا ہے کہ یہ دلوں میں اتر جاتی ہیں،اور دماغ کو بھی سرشار کرتی ہیں۔ان کی نظموں کا اختصار عجز بیانی نہیں بلکہ فن کارانہ چابک دستی کا ثبوت ہے۔ان کی نظمیں شاعر کو نئے ذائقے سے آشنا کرتی ہوئی غور وفکر کے نئے در وا کرتی ہیں۔''[۲]

رشید افروز کے یہاں نیند،خواب اور یاد کلیدی الفاظ ہیں اور تنہائی،سناٹا،پتھر،ریت،غبار،وقت، انصاف،تیرگی،گھر،شہر،جنگل،اداسی،ویرانی،بستی،خاک،کھنڈر،وحشت وغیرہ ان کلیدی الفاظ کے تلازمات کے طور پر ابھرے ہیں۔اور وہ ان کی مدد سے اپنے حسی تجربات کو محسوساتی،بصری اور سماعی پیکروں میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔رشید افروز کی شاعری کا منظر نامہ خوابوں کی شکست وریخت،احساسِ تنہائی،تہذیبی اور سماجی اقدار کی شکست،سیاسی جبر اوران کے جمالیاتی ادراک سے پیدا شدہ متحرک تصویروں سے روشن ہے۔داخلی احساسات،جذبات اور خارجی ماحول کے تصادم سے ان کے یہاں خوب صورت شعری پیکروں کی تخلیق ہوتی ہے۔وہ زندگی کے گونا گوں تجربات سے اپنی فکر کے خاکے میں نئے نئے رنگ بھر کے اپنی شاعری کو رنگا رنگی عطا کرتے ہیں۔

ہمارے شہر کبھی جاؤ اور وقت ملے
ہمارے گھر سے ہماری خبر بھی لے آنا

تمام رات بہلتا رہا ہوں خوابوں سے
سحر ہوئی تو مجھے ڈس گیا مقدر دیکھ

✪✪✪

اندھیرا اس قدر گہرا نہیں تھا
چراغوں میں لہو کم ہو گیا ہے

✪✪✪

شہرِ تمنا راکھ کی چادر، چاند ستارے دھواں دھواں
پل بھر میں اک چنگاری نے کیسی آگ لگائی ہے

✪✪✪

بستی میں کوئی اپنا شناسائی نہیں ہے
یہ کس نے صدا دی ہے؟ مجھے کون پکارے؟

✪✪✪

شہرِ امید کی بستیاں لٹ گئیں
خاک اگلتے ہیں اب آرزو کے کھنڈر

✪✪✪

ساحل پہ ڈوبنے لگی آبِ رواں کی رو
برپا تھا زرد ریت کا طوفان چار سُو

✪✪✪

شام ڈھلتے ہی بھری بستی میں
ایک پُر ہول صدا تیز چلے

اپنے گھر اور شہر سے اپنی خبر اور خیریت لانا گُم ہوئی ذات کی تلاش کے ایسے حسّی پیکر کو مرتسم کرتا ہے جو اداسی اور بے اطمینانی کی کیفیت سے لبریز ہے۔ تمام رات خوابوں سے بہلنا اور سحر ہوتے ہی مقدر کا ڈس جانا ذات کے حوالے سے عصری صورتِ حال کے نتیجہ میں حساس فرد کی محرومی کو نمایاں کرتا ہے۔ چراغوں میں لہو کا کم ہو جانا مسائل کا مقابلہ کرنے کے لیے حوصلہ اور ہمت کی کمی کا اظہار ہے۔ شہرِ تمنا کا راکھ کی چادر بن جانا اور چاند ستاروں کا دھواں ہو جانا حسِ باصرہ کو متحرک کرنے والے عناصر سے موجودہ نظام کے آشوب کی تصویر کشی ہے۔ بستی میں کسی شناسا کے نہ ہونے کے باوجود اپنے لیے کسی صدا کا سننا ایسے سماجی پیکر کو مرتسم کرتا ہے، جو بے سہارا زندگی کے صحرا میں کسی اپنے کے ہونے کا احساس دلائے۔ شہرِ امید کی بستیوں کا جل جانا اور آرزؤں کے کھنڈر کا خاک اگلنا مایوسی اور دکھ کے احساس کو مجسم کر دیتا ہے۔ زرد ریت کے طوفان کا چارسو برپا ہونا اور ساحل پہ آبِ رواں کی رو کا ڈوب جانا ایسے بصری اور حسی پیکر کی نقش گری ہے، جس میں شاعر کا گہرا شعور عصری زندگی کے مصائب، آرزو کی عدم تسکین اور خواب شکن کیفیات کو واضح کر دیتا ہے۔ یہاں معاشرے کے اضطراب اور انتشار سے شاعر کا داخلی اضطراب ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ شام ڈھلتے ہی بھری بستی میں پر ہول صدا کے تیز چلنے کا سامعی پیکر کسی آنے والی افتاد کی نشاندہی کرتا ہے۔

رشید افروز کی شاعری پر اداسی اور تنہائی کے گہرے سایے ہیں۔ یہ ہماری پُر آشوب عصری زندگی کا

عطیہ اور شاعر کے تجربات کا عکس ہے۔عصری زندگی کا کرب اور آشوب جو آج کے انسان کا مقدر بن گیا ہے۔ایک حساس شاعر ان سے کیسے درگزر کر سکتا ہے،لیکن یہی ان کی کل کائنات نہیں ہے۔یہاں روز مرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتیں،رشتوں کا تقدس،انسان اور معاشرے کے تعلق کا اظہار بھی ہے۔ان کی نظم 'واپسی' میں مصائب کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھر کے طاق میں رکھے دیئے کی یاد انسان کی اولین پناہ گاہ یعنی گھر لوٹ چلنے کی دعوت دیتی ہے۔

سیہ بادلوں میں/کہیں چاند بھی کھو گیا ہے/سڑک پر کوئی راہ رو بھی نہیں ہے/ اندھیرا ہے............ ہر سمت گہرا اندھیرا............!/ یہاں کیا ملے گا؟/ یہاں کون ہے؟/کس لیے رات بھر گھومتے ہو؟/ چلو آؤ............گھر لوٹ جائیں............!/ وہاں طاق میں ٹمٹماتا دیا/شام سے منتظر ہے............!!(نظم واپسی)

ان کی شاعری میں رشتوں کے کھوکھلے پن کا شدید احساس اداسی کو جنم دیتا ہے لیکن مقدس رشتوں کی آنچ دلوں میں نرمی اور خلوص بھی بھر دیتی ہے۔نظم 'سہیل کی سالگرہ پر' میں ایک باپ کا اپنے بچے کے لیے محبت کا شدید احساس موجود ہے۔کم سن پریاں دادا پوتی کے خوب صورت رشتے کا تخلیقی ظہور ہے۔

آفس کی اونچی بلڈنگ سے/ میں آکاش کو چھولوں......!/ اور آکاش کے چاند ستارے/ اپنی جیب میں بھر لوں......!!/ گھر لوٹوں/ اور گڈو پوچھے/ پاپا! تم کچھ لائے............؟/ میں اس کے ننھے ہاتھوں پر/ چاند ستارے رکھ دوں............!!/ آج۔میں اپنے گھر جاؤں تو/ خالی ہاتھ نہ جاؤں............!!(نظم سہیل کی سالگرہ پر)

فاعنہ اپّی...... عائشہ گڑیا/عشرت ممّی کی دنیا......!/ گھر میں ہوں/ ...... یا......./ گھر سے باہر....../ آنکھوں میں ہر دم بستی ہیں......!!/ پیار سے جب دادا کہتی ہیں/ دُکھ کے بادل چھٹ جاتے ہیں/ دھوپ نکھر سی جاتی ہے............!!(کم سن پریاں)

نظم 'فاصلہ' میں قبر پر جلتا ہوا چراغ صرف مسافروں کی رہبری کا کام انجام نہیں دے رہا بلکہ موت کی تاریک حقیقت کے سامنے زندگی کی روشن سچائی کو واضح کر رہا ہے۔ورق ورق اضطراب کے ساتھ نئے جہاں کا نصاب لکھنے والے شاعر کے شعری مزاج کو سمجھنے اور واقفیت حاصل کرنے میں اس قبیل کی نظمیں اور اشعار بھی ہماری مدد کرتے ہیں،جن میں مایوسی اور دکھوں کے گہرے اندھیروں میں خدا پر مکمل اعتماد نے شاعر کے دل میں حوصلہ اور امید کی شمع کو جلائے رکھا ہے۔

تجھ سے وابستہ ہوں، ناشاد نہیں ہوسکتا تیرے ہوتے ہوئے، برباد نہیں ہوسکتا

ان کی نظم 'جرأت' زہر آلودہ فضا میں بھی انسان میں جینے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔رشید افروز کا تعلق جدید شاعری سے ہے اور ان کے یہاں جدید شاعری کے موضوعات کی گونج سنائی دیتی ہے لیکن ان کی تخلیقی انفرادیت یہ ہے کہ سماجی اور سیاسی جبر نے انسان کو جس کرب ،ذہنی تنہائی اور ذات کے انتشار کا شکار بنا دیا ہے،اس کی بھر پور تر جمانی میں بھی وہ فنی دل کشی کو ملحوظ رکھتے ہیں۔اس کی مثال ہم گزشتہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں۔یہاں چند اشعار ایسے پیش ہیں جن میں شاعر کے جمالیاتی ادراک نے شعر کے تخلیقی حسن کو نکھار دیا ہے ۔

بچھڑ کے تجھ سے ملی یہ نئی سزا مجھ کو
ترے فراق نے جینا سکھا دیا مجھ کو

یہ سزا اپنا مقدر ہے کہ پتھر نہ ہوئے
ورنہ مڑ کر تو کئی بار اسے دیکھا ہے

✪✪✪

صرف اک بار ملاقات سے کیا ہوتا ہے
ہم سے پوچھے تو سہی، اس کی حقیقت کوئی

✪✪✪

احساسِ غم ذات نے چپی سی لگادی
جس وقت زمانے سے ملاقات ہوئی ہے

✪✪✪

اور کچھ دور ابھی ساتھ تمہیں چلنا ہے
ورنہ رستہ مرے قدموں سے نکل جائے گا

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ رشید افروز ایسے جدید شاعر ہیں جنھوں نے نئی زندگی کے مسائل و موضوعات کے شعری اظہار میں فنی دل کشی کو ملحوظ رکھا ہے۔جدید لفظیات کے ساتھ اکثر انھوں نے روایتی الفاظ سے ایسی تخلیقی تراکیب کو تخلیق کیا ہے جو آج کے انسان اور معاشرے کے انتشار کو واضح کر دے۔ان کے شعری اسلوب میں مروجہ زبان اور فنی پختگی کے ساتھ ندرت اظہار کی خوب صورت آمیزش ہے۔اس آمیزش سے جو جدید اسلوب تیار ہوتا ہے اس میں رشید افروز کی شخصیت اور مخصوص لب ولہجہ کی گونج ہے ۔

اے شہرِ بے صدا! کوئی در بھی کھلا نہ ہو یہ کون روکتا ہے قدم بیچ راہ میں

✪✪✪

اک عکس آئینے میں یہ کہنے لگا کہ تُو؟ مدت کے بعد لوٹ کے آیا جب اپنے گھر

ہم ایسے لوگ زمانے میں ایک تماشا تھے / کہ زندگی سے کبھی اپنی دوستی نہ رہی ......! /

جوخواب ہم نے سجائے......دھواں دھواں نکلے! / شریکِ کار تھے جتنے حریفِ جاں نکلے......! / ہم اپنی ذات کی سرحد پہ سنگسار ہوئے......! / یہ وہم دل میں لیے پھر رہے تھے سڑکوں پر / زمیں نہ ساتھ اگر دے تو غم نہیں کوئی / خلا کے سر پہ حسیں آسماں ہمارا ہے......!! / تمام شب یوں ہی گزری قمار خانے میں / جو داؤ ہم نے لگایا وہی غلط نکلا......!! / جو اپنے پاس تھا سرمایہ سب لٹا بیٹھے......!! (سحر ہونے تک)

آخر میں معبودِ حقیقی کے لیے شاعر کی عقیدت اور محبت کے اظہار میں یہ دو شعر پیش کر کے ہم اپنی بات کا اختتام کرتے ہیں۔

جس نے افلاک کو گرنے سے بچایا، تُو ہے — جس نے ٹھہرے ہوئے پانی پہ بچھائی ہے زمیں
میں جو گرنے سے ہوں محفوظ سہارا تُو ہے — سینکڑوں بار ہوا یوں، مجھے ٹھوکر بھی لگی

رشید افروز نے کم لکھا لیکن جو لکھا وہ بہت غور و فکر کے بعد لکھا۔ انھوں نے جدید اردو شاعری میں اپنی شناخت قائم کی ہے۔ آخر میں وارث علوی کا ایک بیان پیش ہے جو انھوں نے رشید افروز کی تخلیقی صلاحیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''رشید افروز کی ہر شعری تخلیق کے پسِ پشت ایک ذاتی تجربے کی توانائی ہے۔ اگر وہ چاہیں تو اپنی نظم کی شانِ نزول بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کی شاعری ان کی ذات کی پیداوار ہونے کے باوجود محض ذاتی یا شخصی نہیں رہتی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ فن کے تقاضوں سے واقف ہیں اور فنی اظہار میں معروضیت، عمومیت اور دیرپائی کے اثرات پیدا کرنے کے لیے وہ اپنی ذات کو اپنے شعر سے ایک مخصوص فاصلے پر رکھنے کے جمالیاتی اصول سے واقف ہیں اور عمل پیرا بھی۔'' [۳]

حوالہ جات:

۱۔ نصاب (شعری مجموعہ)، رشید افروز، ثروت پبلشرز، احمد آباد، ۲۰۲۱ء، ص ۶

۲۔ سہ ماہی 'رنگ' دھنباد، اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۶

۳۔ نصاب (شعری مجموعہ)، رشید افروز، ص ۱۰۔۹



ڈاکٹر محبوب حسن
شعبۂ اردو، ڈی ڈی یو، گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور، رابطہ نمبر:8527818385

علامہ اقبالؔ اور نسل نو

تلخیص:

علامہ اقبال نے جدید خیالات اور نظریات کی روشنی میں ادبِ اطفال کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ انھوں نے نسل نو کے لیے جو نظمیں تخلیق کیں، وہ محض تفریحی نہیں بلکہ تعلیمی، تربیتی اور اصلاحی مقاصد پر مبنی ہیں۔ ان کی شاعری میں نسل نو کی فکری تربیت، قومی یکجہتی، اخلاقی اقدار اور حب الوطنی جیسے جذبات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اقبالؔ کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظمیں آج بھی نصاب میں شامل ہیں اور بچوں کی ذہنی پرورش میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ ان کی نظموں میں موجود سادگی، روانی اور درس آموز پہلو نسلِ نو کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اقبالؔ نے نہ صرف بچوں کی ذہنی سطح کا خیال رکھا بلکہ ان کے اندر بلند خیالی، خود اعتمادی اور عملی جدو جہد کا جذبہ بھی بیدار کیا۔ علامہ اقبالؔ کی ادبی، فکری اور تعلیمی خدمات آنے والی نسلوں کے لیے بھی اسی طرح روشنی کا مینار بنی رہیں گی۔ آج کے پُر آشوب دور میں، جہاں بچوں کے لیے معیاری اور با مقصد ادب کی کمی محسوس کی جا رہی ہے، اقبالؔ کی نظمیں ایک مثالی نمونہ ہیں، جو ہمیں ادبِ اطفال کی اہمیت اور اس کی افادیت کا احساس دلاتی ہیں۔ آج بھی اگر ہم نسلِ نو کی فکری اور اخلاقی تربیت چاہتے ہیں تو ہمیں اقبالؔ کے پیغام کو عام کرنا ہوگا اور ان کی نظموں کو بچوں کے تعلیمی و تربیتی نظام کا لازمی حصہ بنانا ہوگا۔

کلیدی الفاظ:

علامہ اقبال، نسل نو، فکری تربیت، اخلاقی اقدار، بلند خیالی، خود اعتمادی، عملی جدو جہد۔

علامہ اقبالؔ اردو شعر و ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ انھوں نے اردو شعر و ادب کو فکر و فن دونوں اعتبار سے بلندی عطا کی۔ روایت شکن تخلیق کار علامہ اقبالؔ نے اردو شاعری کو ایک فکر و فن کی نئی نئی

جہتوں سے روشناس کرایا۔شاعری کے علاوہ انھوں نے نثری ادب میں بھی اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ان کی تخلیقات عالمی ادبیات کے مقابلے میں رکھی جاسکتی ہیں۔علامہ اقبالؔ کا اصل کارنامہ ان کا فلسفۂ خودی ہے۔موصوف نے اپنے فلسفۂ خودی کے توسط سے اردو شاعری کی رگوں میں تازہ لہو دوڑایا۔ اقبالؔ کی غزلوں بالخصوص نظموں میں اس فلسفے کے گہرے نقوش ثبت ہوئے۔علامہ اقبالؔ نے قدیم شعری روایت سے قطع نظر آفاقی افکار ونظریات کو تخلیقی بصیرت کے ساتھ موضوع بحث بنایا۔اقبالؔ کی آفاقی اور ہمہ گیر فکر وفلسفہ کا اعتراف عالمی سطح پر کیا گیا۔ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد آج بھی علامہ اقبال کی تخلیقی و ادبی عظمت میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔

ان کی تخلیقی عظمت کے پیش نظر ان پر بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے گئے۔قابل غور ہے کہ ادب اطفال کے حوالے سے بھی علامہ اقبالؔ کی تخلیقی شخصیت ہمارے لیے قابل قدر ہے۔انھوں نے فلسفیانہ اور سنجیدہ شاعری کے علاوہ نونہالوں کی ذہنی پرورش پر بھی خصوصی توجہ دی۔علامہ اقبالؔ ملک ومعاشرے کی تشکیل وتعمیر کے لیے نئی نسل کی ذہنی تربیت کو لازمی سمجھتے تھے۔انھوں نے اپنی تخلیقی زندگی کے ابتدائی دور میں بچوں کے لیے متعدد اہم نظمیں تخلیق کیں۔ان کی نظمیں بچوں کی ذہنی ونفسیاتی کیفیت کے پیش نظر لکھی گئی ہیں۔اقبالؔ کی نظموں میں جگہ جگہ غضب کا ڈرامائی حسن موجود ہے۔ان کی نظمیں فکری وفنی دونوں اعتبار سے اپنی تخلیقی انفرادیت کا احساس دلاتی ہیں۔علامہ اقبالؔ کی نظموں میں موجود مکالماتی انداز انھیں دوسرے شاعروں سے ممتاز بناتا ہے۔اردو میں ادب اطفال کی روایت کو مستحکم کرنے میں علامہ اقبالؔ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔انھوں نے بزرگ ادیبوں اور شاعروں کی قائم کردہ روایات کو مزید توانائی بخشی۔یہی وجہ ہے کہ ادب اطفال پر مشتمل اقبالؔ کی تخلیقات نسل نو کی ذہنی تربیت کے لیے ناگزیر ہیں۔

اردو زبان میں ادب اطفال کی ایک قابل قدر روایت موجود ہے۔ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے ابتدا سے ہی بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں تخلیق کیں۔ادب اطفال کی آبیاری کرنے والے ادیبوں میں خواجہ الطاف حسین حالیؔ، محمد حسین آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد اور شوکت پردیسی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔علامہ اقبالؔ کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ ادب اطفال کو فکر وفن کی نئی جہتوں سے آشنا کیا۔انھوں نے اپنی تخلیقات میں اخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ ماحولیاتی موضوعات ومسائل پر بھی خاطر خواہ توجہ دی۔اخلاقی قدروں سے مزین علامہ اقبالؔ کی نظمیں ہمیں انسان دوستی، ہمدردی، مروت، صبر وقناعت اور خلوص ومحبت کا درس دیتی ہیں۔علامہ اقبالؔ کی نظموں میں ایک نوع کا موسیقی آہنگ موجود ہے۔ان کی نظمیں خوب صورتی سے گائی جاسکتی ہیں۔ادب اطفال پر مشتمل

اقبالؔ کی نظمیں ان کے پہلے شعری مجموعہ 'بانگ درا' میں شامل ہیں۔ ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، بچے کی دعا، ہمدردی، ماں کا خواب، پرندہ کی فریاد، ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، پرندہ اور جگنو جیسی بیش بہا نظمیں اقبالؔ کی تخلیقی بصیرت کا عمدہ ثبوت ہیں۔ مذکورہ نظموں میں سے سات نظمیں انگریزی نظموں سے ماخوذ ہیں۔ علامہ اقبالؔ کی نظموں کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے:

''اپنے ملک وقوم کے بچوں کے مستقبل سے اقبالؔ کو بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے نونہالوں کی فکری آبیاری اور پرورش کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے انھوں نے ایسی دل کش نظمیں لکھی ہیں، جنھیں بچے شوق سے پڑھ کر ان میں بیان کی ہوئی تعلیمات پر عمل کر کے اپنے ملک کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔'' (اقبال کی کہانی، جگن ناتھ آزاد، ترقی اردو بیورو، ۱۹۷۶، ص ۱۲)

علامہ اقبالؔ نے اپنی نظموں کے توسط سے ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور مذہبی یگانت کا بھی درس دیا ہے۔ اقبالؔ کسی بھی ملک کی ترقی اور کامیابی کے لیے قومی یکجہتی کو لازمی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قومی اتحاد کے بغیر کوئی بھی ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ ان کی مشہور ترین نظم 'نیا شوالہ' قومی یکجہتی کے اعتبار سے نہایت عمدہ تخلیقی فن پارہ ہے۔ اقبالؔ کے اولین مجموعۂ کلام 'بانگ درا' میں شامل یہ نظم اپنے موضوع اور انداز پیش کش کے اعتبار سے اپنی مثال ہے۔ اس نظم میں اقبالؔ مختلف مذہبی طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے مخاطب ہیں۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو فرقہ وارانہ یگانگت اور مذہبی رواداری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا پیغام دیا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے واعظ اور برہمن کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اقبالؔ کو اہل وطن کے درمیان پیدا شدہ نفرت کا ماحول پسند نہیں۔ انھوں نے فرقہ وارانہ تعصب وعداوت کے لیے مذہبی تنگ نظری کو قصوروار ٹھہرایا ہے۔ اقبالؔ کی وطن پرستی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں خاک وطن کا ہر ذرہ دیوتا لگتا ہے۔ علامہ اقبالؔ مذہبی تعصب کی دیوار گرا دینا چاہتے ہیں تا کہ اہل وطن کے درمیان خلوص ومحبت کا ماحول پیدا ہو سکے۔ ملک کی موجودہ صورت حال میں اس نظم کی معنویت مزید بڑھ جاتی ہے۔ نظم 'نیا شوالہ' کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا

جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

علامہ اقبالؔ کی شاعری میں حیات وکائنات کے گہرے رموز موجود ہیں۔انھوں نے اپنے شعری سفر کا آغاز روایتی انداز میں غزل گوئی سے کیا لیکن جلد ہی فلسفیانہ شاعری کی جانب متوجہ ہو گئے۔فکر وفلسفہ کے ساتھ ساتھ انھوں نے نونہالوں کی ذہنی تربیت پر بھی خاص توجہ مرکوز کی۔اقبالؔ کو اپنے وطن اور اپنی سرزمین سے والہانہ محبت تھی۔وہ حب الوطنی کو ایمان کا اہم جز تصور کرتے تھے۔اقبالؔ نے اپنی نظموں کے توسط سے وطن پرستی اور حب الوطنی کا خوب صورت پیغام دیا ہے۔ترانہ ہندی، ہمالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ جیسی اہم نظمیں علامہ اقبالؔ کے جذبات واحساسات کو آشکار کرتی ہیں۔حب الوطنی پر مشتمل اقبالؔ کی نظموں میں ہندستان کے قدرتی مناظر اور یہاں کے حسن ودل کشی کا خوب صورت تخلیقی اظہار موجود ہے۔ان کی نظموں میں ملک کے جغرافیائی حسن مثلاً پہاڑوں، جھرنوں، ندیوں، پھل پھول اور چرند پرند کی تصویرکشی موجود ہے۔ایسی تخلیقات بچوں کو قدرتی حسن اور ماحولیاتی نظام کے تئیں بیدار کرتی ہیں۔'ترانہ ہندی' علامہ اقبالؔ کی نہایت مشہور نظم ہے۔حب الوطنی سے لبریز یہ نظم ہمارے اندر اپنے وطن عزیز کے تئیں محبت کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔نظم 'ترانہ ہندی' کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں، اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا
یونان ومصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے

اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا

دراصل نظم 'ترانہ ہندی' اقبالؔ کی وطن پرستانہ شاعری کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ یہ نظم ملک ہندوستان کی عظمت اور اس کے وقار کو ایک نئی تازگی اور توانائی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اہل وطن میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے یہ نظم ملک کی مختلف قومی تقریبات کے موقع پر گائی جاتی ہے۔ خاص طور پر جشن آزادی اور یوم جمہوریہ کے موقع پر ہندوستانی فوج اس نظم کی دھن پر پریڈ کرتی ہے۔ مہاتما گاندھی نے نظم 'ترانۂ ہندی' کی تعریف کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا ہے''جب اقبال کی مشہور نظم ہندوستاں پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور بڑودا جیل میں تو سینکڑوں بار اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ کون ایسا ہندوستانی دل ہے، جو اقبال کا ہندوستاں ہمارا سن کر دھڑکنے نہیں لگتا اور اگر کوئی ایسا دل ہے تو میں اسے اس کی بدنصیبی سمجھوں گا۔'' گاندھی جی کی ان باتوں سے نظم 'ترانہ ہندی' کی مقبولیت کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔

انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں میں اخلاقی قدروں کے شانہ بہ شانہ سائنسی اور ماحولیاتی موضوعات ومسائل پر خاص توجہ دی جارہی ہے۔ اگر ہم اردو کے حوالے سے ادب اطفال کا جائزہ لیں تو ہمیں مایوسی ہاتھ آتی ہے۔ قابل غور ہے کہ موجودہ دور میں ہمارے یہاں چلڈرین لٹریچر کو دوئم درجے کا ادب تصور کیا جاتا ہے۔ ادب اطفال کے تئیں ادیبوں اور شاعروں کی یہ بیزاری ہمیں دعوت فکر دیتی ہے۔ ہمیں سائنسی اور ماحولیاتی موضوعات ومسائل کی جانب متوجہ ہونے کی اشد ضرورت ہے تاکہ ہمارے بچے عصری زندگی کے نت نئے تقاضوں سے واقف ہوسکیں۔ دراصل خدا کی عطا کردہ بیش بہا نعمتوں کا تحفظ ہماری بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ماہرین نے فضائی آلودگی کو دنیا کا سب سے سنجیدہ اور نازک مسئلہ قرار دیا ہے۔ یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ آج پورا سنسار طرح طرح کی مہلک بیماریوں سے پریشان ہے۔ کرونا جیسی عالمی وبا کے خوف ناک نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ خوش آئند بات ہے کہ گزشتہ چند برسوں سے اردو زبان وادب میں بھی ان اقدار وروایات کی جانب خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ علامہ اقبالؔ کے پہلے شعری مجموعہ 'بانگ درا' میں مکڑا اور مکھی، پہاڑ اور گلہری، گائے اور بکری، پرندے کی فریاد جیسی خوب صورت اور سبق آموز نظمیں موجود ہیں۔ زیب النسا بیگم نے اقبالؔ کی نظموں میں موجود اخلاقی نکات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اقبالؔ کے بچوں کے کلام میں جو چیز قابل ذکر ہے، وہ اقبال کا اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ اقبالؔ کی فکر ونظر بلند اخلاقی قدروں کی طرف مائل ہے۔ ماخوذ نظموں میں فطرت کے بے شمار مناظر ومظاہر کا تذکرہ کرکے ان سے اخلاقی حکایتیں سنائی جاتی ہیں۔ سماج میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے جس صالح ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے پیش نظر اقبالؔ نے اخلاقی نظموں کو پیش کرکے ذہن کی پختگی اور فکر کی بالیدگی کا ثبوت دیا ہے۔'' (اقبال اور بچوں کا ادب، زیب النسا بیگم، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۳)

انسانی شخصیت کی تشکیل وتعمیر میں اخلاقی اقدار اساسی کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ادیبوں اور شاعروں نے بچوں کی ذہنی تربیت کی غرض سے اخلاقی قدروں کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ، محمد حسین آزاد، اسمٰعیل میرٹھی اور علامہ اقبالؔ وغیرہ نے اپنی سبق آموز نظموں کے توسط سے نونہالوں کے اندر اخلاقی اقدار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی مختلف نظموں میں وفاداری، خلوص، محبت، رواداری، قربانی، نیکی اور ہمدردی کے پیغامات موجود ہیں۔ اقبالؔ کی متعدد نظموں میں اخلاقی پہلو نمایاں طور پر ابھرتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظم 'ایک مکڑا اور مکھی' کے ذریعہ بے جا خوشامد اور جھوٹ سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ نظم 'ایک پہاڑ اور گلہری' میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا نے دنیا کی ہر چیز کسی خاص مصلحت کے تحت بنائی ہے۔ خدا کی نظر میں کوئی چیز چھوٹی یا بڑی اور اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ اس لیے انسان کو اپنی طاقت یا کسی خوبی پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔ نظم 'ہمدردی' کے پس پردہ اقبالؔ نے نیکی اور اچھائی کا درس دیا ہے۔ اس فن پارہ میں اقبالؔ نے اس بات کی نصیحت کی ہے کہ دوسروں کے کام آنے والا انسان ہی خدا کی نظر میں نیک ہوتا ہے۔ مذکورہ نظمیں نصیحت آمیز اور ڈرامائی انداز میں بچوں کو متاثر کرتی ہیں۔ نظم 'پرندے کی فریاد' آزادی کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اقبالؔ نے یہ پیغام دیا ہے کہ غلامی ایک قسم کی لعنت ہے۔ پیش نظر نظم بچوں کے ساتھ ساتھ ہر عمر کے لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ اس نظم میں سبھی کے لیے بیش بہا پیغام ہے۔ نظم 'پرندے کی فریاد' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر، آتا ہے یاد جس دم

شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت، وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ

علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ تعمیری طرزِ فکر کو بنیادی اہمیت دی ہے۔فلسفیانہ اور سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ انھوں نے بچوں کی نظموں میں بھی تعمیری افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے۔اردو زبان و ادب کے ابتدائی دور سے ہی ادبِ اطفال کی روایت نظر آتی ہے۔جدت پسند شاعر علامہ اقبال نے روایتی طرزِ فکر سے قطع نظر اپنی ایک منفرد تخلیقی راہ قائم کی۔ادبِ اطفال پر مشتمل ان کی نظموں میں فکری و فنی جدت پسندی کی خوب صورت مثالیں نظر آتی ہیں۔ایک دور اندیش تخلیق کار کے طور پر علامہ اقبال مستقبل کے تقاضوں اور مسائل کو بھی بخوبی سمجھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی ان کی شاعری کی عصری معنویت برقرار ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں فن اور تکنیک کے نئے نئے تجربات کیے۔ان کا تخلیقی وجدان اور شعری ادراک سب سے جداگانہ ہے۔ان کی نظموں سے بصیرت کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ان کی نظموں کے ڈرامائی عناصر اور ان کا مکالماتی نظام انھیں دوسرے شاعروں اور ادیبوں سے ممتاز بناتا ہے۔نظم 'ایک پہاڑ اور گلہری' کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

کہا یہ سن کے گلہری نے، منھ سنبھال ذرا
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انھیں نکال ذرا
جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا
نہیں ہے توبھی تو آخر مری طرح چھوٹا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا، کوئی چھوٹا، یہ اس کی حکمت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے
قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

مذکورہ بالا شعری اقتباس سے اقبالؔ کی تخلیقی ہنرمندی جھلکتی ہے۔ روایتی طرزِ اظہار کے برعکس علامہ اقبال کے یہاںؔ ایک منفرد تخلیقی شعور کا احساس ہوتا ہے۔ 'ایک پہاڑ اور گلہری' کے علاوہ 'ایک مکڑا اور مکھی'، 'ایک گائے اور بکری'، 'ایک پرندہ اور جگنو' جیسی خوب صورت اور سبق آموز نظمیں بچوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ اقبالؔ کی نظموں کی ایک اہم خوبی ان میں موجود موسیقیت اور غنائیت ہے۔ علامہ اقبالؔ شاعری کے اس خاص وصف سے بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں روانی، بے ساختگی اور ایک قسم کا فطری پن جھلکتا ہے۔ اقبالؔ کی نظموں کی ایک اور خصوصیت دل کش تصویر کشی ہے۔ ان کی نظمیں پڑھتے ہوئے پورا منظر نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے نونہالوں کی تربیت اور ان کی ذہنی نشو و نما میں خصوصی دلچسپی لی۔ اقبالؔ کی نظموں میں ہمیں کسی قسم کی تنگ دامانی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ان کے یہاں موضوعاتی تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ علامہ اقبالؔ نے نسلِ نو کے لیے جو تخلیقی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے، اس کی معنویت تا دیر قائم رہے گی۔

☆☆☆

کتابیات:

۱۔ کلیاتِ اقبال، علامہ اقبال، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۶ء
۲۔ اقبال اور بچوں کا ادب، زیب النسا بیگم، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۲۰۰۰ء
۳۔ اقبال کی کہانی، جگن ناتھ آزاد، ترقی اردو بیو، دہلی، ۱۹۷۶ء
۴۔ اقبال سب کے لیے، فرمان فتحپوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۰ء
۵۔ اقبال فن اور فلسفہ، نور الحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۹ء
۶۔ فہمِ اقبال، شمیم طارق، شفاعت بک ڈپو، مولوی گنج، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء

☆☆☆

عبدالوہاب قاسمی
سینئر سیکنڈری اسکول، بیلوا، ارریہ، رابطہ نمبر:7631677978

ظفر کمالی کی 'رباعیاں': ایک مطالعہ

تلخیص:

'رباعیاں' ظفر کمالی کی رباعیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔فن کی جو اٹھان یہاں سے ہوئی ہے وہ ان کے دوسرے مجموعے 'رباعیاتِ ظفر' اور رباعیوں کے دیوان 'خاکِ جستجو' میں مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر ظفر کمالؔی نے اپنی رباعیوں میں موضوعات کے پہلو بہ پہلو جن نکتوں سے آشنا کرایا ہے وہ عام ہوتے ہوئے بھی شعریت پیدا کرنے میں کامیاب ہیں اور پھر کہیں بھی موضوعات کی مماثلت اسلوب کی مماثلت نہیں بن پاتی ہے۔غور طلب امر یہ ہے کہ آج کے عہد کا ایک رباعی گو روایات سے منسلک ہوتے ہوئے بھی ہمیں ایک نیا احساس دینے میں کامیاب ہے۔

ان کی رباعیوں کے زیادہ تر موضوعات کا تعلق اس بات پر ہے کہ انسان انھیں جذبۂ حقارت و نفرت سے نہ دیکھے جن کے وجود سے انسان اور سماج دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ستم زدگی، جنگ کی کیفیت، دلی عناد، اونچ نیچ کی دیوار، باغی کی بغاوت، انانیت پرستی اور دوست احباب کی آپسی چپقلش سماج کی کچھ ایسی کیفیات ہیں جن کے پھیلتے دائرے تشویشناک ہیں۔ ان سے شاعر کے اندر جس جذبۂ حقارت نے سر ابھارا ہے وہ رباعیوں کے پیکر میں موجود ہیں، جنھیں پڑھتے ہوئے ہم نہ صرف شاعر کے اس جذبۂ نفرت کو محسوس کرتے ہیں بلکہ ترسیل کے لیے جو لسانی نظام اور ترکیبی ساخت شاعر کے پیش نظر ہے اس پر بھی نظر ٹھہر جاتی ہے۔

ڈاکٹر ظفر کمالؔی نے اپنی رباعیوں میں جو محاورات استعمال کیے ہیں وہ اپنے پس منظر کے ساتھ رباعی کی دل کشی اور سلاست و روانی میں اضافہ کرتے ہیں۔شاعری میں محاورات کے تہذیبی اور معاشرتی پس منظر کے ساتھ استعمال سے کسی بھی شاعر کے لسانیاتی سطح پر منضبط ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔محاورے اپنے

ترکیبی نظام میں ہماری زندگی، سماجی رویہ اور نفسیات کی وسیع کائنات رکھتے ہیں۔شاعر اگر ان کے ہنرمندانہ استعمال کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کی شاعری میں سماج کی مصوری معنی خیز ہوجاتی ہے۔ڈاکٹر ظفر کمالی کی رباعیاں محاوراتی لہجے میں ہمارے سماج کی کچھ ایسی ہی معنی خیز تصویریں پیش کرتی ہیں۔

کلیدی الفاظ:

ظفر کمالی، رباعیاں، جذبہ حقارت، اونچ نیچ، لسانی نظام، ترکیبی ساخت، محاوراتی لہجہ۔

شاعری کو اگر جذبوں کی زبان مل جائے تو صحرا کے سناٹے بھی نغمہ بار ہوجاتے ہیں۔اسی شاعری کو دوامیت ملتی ہے، جس میں احساس کی نئی عبارتیں اور اظہار کی نئی اشارتیں منور ہوں۔اگر شاعر تخیل کی نئی منطق اور لفظ کے نئے زاویوں سے اپنی تخلیقی کائنات روشن کرتا ہے تو اس کی شاعری ہر گزرتے لمحات کے ساتھ مکالمے کے در کھولتی چلی جاتی ہے۔

ہر عمدہ شاعری کی خصوصیات میں ان دو باتوں کو ہمیشہ ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔''شاعر کیا کہہ رہا ہے اور کس لہجے میں کہہ رہا ہے۔''، یعنی موضوعات اور اسلوب یہ دو ایسے منطقے ہیں جہاں سے شعری کائنات کی انفرادی راہیں متعین ہوتی ہیں اور یہ منطقے اسی شاعری میں انفرادی رنگ و آہنگ اختیار کرتے ہیں جس میں شاعر کے سوز دل اور خون جگر کی شمولیت ہوتی ہے۔جس شاعر کے ہاں مشاہدات و تجربات میں جس قدر وسعت و گہرائی ہوگی، محسوسات میں جس درجہ شدت ہوگی، زندگی کے چھوٹے بڑے وقوعوں پر عرفانی آنکھ اور شعوری بصیرت جس طرح بیدار ہوگی اسی طرح موضوعات کی نیرنگی اپنا جلوہ بکھیرے گی۔وہ چھوٹی چھوٹی وارداتوں میں ایسے امکانات روشن کرے گا جہاں عام نگاہوں کی رسائی نہیں ہوسکتی۔چوں کہ شاعری اس معنی میں تاریخ سے الگ ہے کہ تاریخ گزرتے ہوئے کل کا اظہار ہے اور شاعری آنے والے کل کے امکانات کا بیان بھی ہوتی ہے۔تو ایسا شاعر موضوعاتی سطح پر اپنی انفرادی کائنات تخلیق کرے گا۔

اسلوب کے تئیں بھی اگر وہ طرز ادا، تفحص الفاظ، برمحل استعمال، موزوں تشبیہات و استعارات سے ایسا شعری پیکر تراشتا ہے جس میں وہ مخصوص اثرات جو اس کے درون میں مرتعش ہوئے ہیں منتقل ہوجائیں تو نہ صرف یہ کہ وہ اپنے اسلوب سے پہچانا جائے گا بل کہ قاری کو اس کیفیت میں اپنا شریک بھی بنالے گا۔

ڈاکٹر ظفر کمالی کا شعری مجموعہ 'رباعیاں' پڑھتے ہوئے موضوعات کی وسعت اور اسلوب کے منفرد آہنگ نے مجھے حد درجہ متاثر کیا۔موضوعات کے ساتھ معروضی تلازمات کی جستجو نے ان کی شاعری میں کیفیت دیگر کا احساس دلایا۔ان کے ہاں خارجی واقعات حسی تجربوں میں اس طور پر ظاہر ہوتے ہیں کہ وہ

مخصوص جذبہ جوفن کار کے پیش نظر تھا قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ان کے فن کا مطالعہ کرتے ہوئے زیریں لہروں سے یہ نکتہ بھی ہاتھ آتا ہے کہ وہ کچھ بھی کہنے سے پہلے اس کے پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔اس کے مثبت و منفی زاویوں کو پیش نظر رکھتے ہیں اور آس پاس کے منظر ناموں پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ ان کی یہ نظر کبھی اتنی قریب ہوتی ہے کہ انفس کا بیان ان کی رباعیوں میں درآتا ہے اور کبھی اتنی دور چلی جاتی ہے کہ آفاق منور ہوجاتے ہیں۔

کتاب کی پہلی رباعی پر نظر ڈالیے تو جہانِ معنی کے کئی سرے ہاتھ آتے ہیں۔انھوں نے اپنے جذبے کو رباعی کے پیکر میں قاری تک پہنچاتے ہوئے جس 'جنسِ گراں' کی بات کی ہے وہ ان کے فکر وفن سے عبارت ہے۔پھر اپنی آواز کو اذان کا استعارہ بنا کر سماج کی مردہ دلی اور بے ضمیری کو جگانے کی شعوری کوشش بھی کی ہے۔جہاں آج ہر وہ آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہے جو اسے جگائے، جھنجھوڑے اور وقوعات سے باخبر کرے۔

جذبوں کو رباعی کی زباں دے دی ہے جو پاس تھی وہ جنس گراں دے دی ہے
آواز مری کوئی سنے یا نہ سنے دینی تھی مجھے میں نے اذاں دے دی ہے

اس رباعی سے ان کی خوداعتمادی اور اپنے فن کے تئیں طمانیت کا پہلو بھی درخشاں ہوتا ہے کہ آئندہ رباعیوں میں جو افکار و خیالات پیش کیے جائیں گے وہ اسی دنیا اور اس میں بستے انسانوں سے منسلک سنگلاخ حقیقتوں کا بیانیہ ہوں گے جو میں نے اپنے مشاہدات و تجربات اور مطالعات کائنات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی لیے وہ بڑے اعتماد سے کہتے ہیں کہ تم سنو یا نہ سنو مجھے اذاں دینی تھی، دے دی اور جو حقائق دنیا کی نگاہوں میں اجاگر کرنے تھے وہ کردیئے۔یہ خوداعتمادی اس رباعی میں ارتقائی صورت اختیار کرگئی ہے۔

خاموش تماشائی ہے کیوں بولے گا بے وقت کوئی بھید نہیں کھولے گا
ہوجائے گی دنیا کو حقیقت معلوم میزان میں جب وقت ہمیں تولے گا

پھر یہی خوداعتمادی خیام کی تسکین روح کا سامان بن گئی ہے۔

ہے اس میں ہی مے خانے کا دل جام کی روح ہے وجد میں خود ساقیِ گل فام کی روح
جنت میں ظفرؔ پڑھ کے رباعی میری دیتی ہے دعائیں مجھے خیام کی روح

ان تینوں رباعیوں میں معروضی تلازمات نے جن افکار کو محسوس بنایا ہے ان میں خوداعتمادی تو بالکل سامنے کی چیز ہے مگر ان کے بطون میں وقت کا جبر جس بے اعتنائی کا پیش خیمہ ہے اسے شاعر نے غیر معمولی طور پر حسّی بنانے کی کوشش کی ہے۔'آواز مری کوئی سنے یا نہ سنے' 'میزان میں جب وقت ہمیں تولے گا' اور 'دیتی

ہیں دعائیں مجھے خیّام کی روح' ایک سلسلے وار کہانی کا کلائمکس ہیں جو رباعی کی زبان میں ڈھل گئے ہیں۔

رباعی کا فن اپنی نزاکت، نفاست اور لطافت میں دیگر شعری اصناف کے مقابل بڑا نازک بھی ہے اور محنت و ریاضت کا متقاضی بھی۔ یہاں چار مصرعوں میں ہی جامع سے جامع مضمون کو حسن و دل کشی کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اس میں بحر ہزج کے چوبیسوں اوزان میں سے کسی بھی وزن پر ارتکاز ضروری ہے۔ پھر چوتھے مصرعے پر شاعر جتنا خونِ جگر صرف کرے گا اتنی ہی حسن و دل کشی، برجستگی اور مربوط فضا کو اپنی رباعی کے بطون میں لہرا پائے گا جس سے بقیہ تینوں مصرعے بھی نکھر کر قاری کے احساس کو بیدار کریں گے۔

ڈاکٹر ظفر کمالی کا اختصاص یہ ہے کہ انھیں رباعی کے فن پر قدرت حاصل ہے۔ اوزان و بحور کے تئیں انھوں نے اپنی فنی پختگی کو ناقدین سے منوایا ہے۔ بعض رباعیوں میں انھوں نے ہیئتی تجربوں سے جدت طرازی کے نمونے بھی پیش کیے ہیں، جن میں فکر کی نئی جہت اور اوزان کو نئے پیرہن مل گئے ہیں۔ مگر رباعی محض اوزان و بحور پر دسترس حاصل کرنے کا نام نہیں بلکہ ایک خاص نکتہ، خیال اور ایک مخصوص جذبے کو بیانیہ کی سپاٹ سطح سے گریز کرتے ہوئے شعریت کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالتا ہے۔

رباعی میں ایک مقام موضوع کے انتخاب کا آتا ہے۔ عموماً فلسفہ، تصوف، پند و نصائح، حمد و نعت، منقبت، اخلاقیات، فکرِ عقبیٰ اور بے ثباتیِ دنیا اس کے موضوعات قرار دیئے گئے ہیں لیکن یہ تحدیدی موضوعات نہیں ہیں۔ رباعی گو کے ذہنی دریچے اگر کھلے ہیں اور وہ نئی دنیا اور بدلتے منظرناموں سے آشنا ہے تو کسی بھی تجربے، وقوعے، مشاہدے، المیے اور حادثے کو رباعی کے پیکر میں ڈھال سکتا ہے۔ ذیل کی رباعیوں میں شاعر نے فکری سطح پر روایت سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے بھی پایمال موضوع کی پیش کش میں انفرادی اسلوب کے منطقے روشن کیے ہیں۔ میر انیس کی ان تینوں رباعیوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ظفر کمالی کی بھی اسی موضوع پر تین رباعیاں دیکھیے۔

میر انیسؔ	ظفر کمالی
آدم کو عجب خدا نے رتبا بخشا	معلوم ہے انسان کو انسان ہے کیا
ادنیٰ کے لیے مقام اعلیٰ بخشا	اس جسم کی صورت میں یہ زندان ہے کیا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایمان	کہتے ہیں تمھیں نفس کا عرفان نہیں
اس ایک کفِ خاک کو کیا کیا بخشا	اس نفس کا عرفان بھی آسان ہے کیا

......

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی	پیوند ہوئے خاک کا جو پیر و جواں

ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی
ڈھونڈے سے نہیں ملتا کہیں ان کا نشاں
کچھ کرلو ابھی وقت میسر ہے تمھیں
اڑجائے نہ تنکے کی طرح عمر رواں

......

کیوں زر کی ہوس میں در بدر پھرتا ہے
جانا ہے تجھے کہاں؟ کدھر پھرتا ہے
اللہ رے پیری میں ہوس دنیا کی
تھک جاتے ہیں جب پاؤں تو سر پھرتا ہے
ہر قید سے ہر بندِ قفس سے گزرے
دنیا کے لیے حرص و ہوس سے گزرے
جب اس کی حقیقت سے ہوئے ہم واقف
یہ کہنے لگے بارِ نفس سے گزرے

پہلی دو رباعیوں میں دنیا کی بے ثباتی کا اظہار اور تیسری رباعی میں حرص و ہوس کا بیان موجود ہے۔
امجد حیدرآبادی، حالی اور احمد فراز کی ایک ایک رباعی کے بالمقابل ڈاکٹر ظفر کمالی کی رباعیاں بھی ملاحظہ کیجیے ۔

بچپن ہی کے پہلو میں جوانی بھی تو ہے
باقی ہی کی آغوش میں فانی بھی تو ہے
سمجھے ہو غلط روح جدا، جسم جدا
جو برف کی شکل ہے، وہ پانی بھی تو ہے
(امجدؔ)

ہے عمر جوانی کی تو ڈھل جائے گی
جُل دے گی تمھیں دے کے نکل جائے گی
تم سمجھو اسے دھوپ میں رکھی ہوئی برف
یہ آنکھ جھپکتے ہی پگھل جائے گی
(ظفر کمالیؔ)

مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئیں گے
جب یاد کریں گے مجھے تب روئیں گے
الفت پہ، وفا پہ، جاں نثاری پہ مری
آگے نہیں روئے تھے تو اب روئیں گے
(حالیؔ)

تم اشکِ ندامت سے ہی منھ دھوؤ گے
کانٹوں کے ہی بستر پہ سدا سوؤ گے
آئے گا تمھیں یاد بہت میرا خلوص
مرنے پہ مرے پھوٹ کے تم روؤ گے
(ظفر کمالیؔ)

جب روح کسی بوجھ سے تھک جاتی ہے
احساس کی لو اور بھڑک جاتی ہے
میں بڑھتا ہوں زندگی کی جانب لیکن
زنجیر سی پاؤں میں چھنک جاتی ہے
(فرازؔ)

اس جسم کے زندان میں گھبراتی ہے روح
گھبراتی ہے، اکتاتی ہے، پچھتاتی ہے روح
لگتی ہے جو چوٹ اس کو تڑپ اٹھتی ہے
انسان گنہ کرتا ہے شرماتی ہے روح
(ظفر کمالیؔ)

اس تقابل میں ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر ظفر کمالی نے اپنی رباعیوں میں موضوعات کے پہلو بہ پہلو جن نکتوں سے آشنا کرایا ہے وہ عام ہوتے ہوئے بھی شعریت پیدا کرنے میں کامیاب ہیں اور پھر کہیں بھی موضوعات کی مماثلت اسلوب کی مماثلت نہیں بن پاتی ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ آج کے عہد کا ایک رباعی گو روایات سے منسلک ہوتے ہوئے بھی ہمیں ایک نیا احساس دینے میں کامیاب ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایلیٹ کے ایک مضمون 'روایت اور انفرادی صلاحیت' کے ترجمے کے تحت لکھا ہے:

> ''کوئی شاعر، کوئی فن کار تنِ تنہا اپنی کوئی الگ مکمل حیثیت نہیں رکھتا، اس کی اہمیت اور بڑائی اس میں مضمر ہے کہ پچھلے شعرا اور فن کاروں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ جس طرح ماضی حال کو متعین کرتا ہے اسی طرح حال ماضی کو بھی بدلتا رہتا ہے۔'' (ارسطو سے ایلیٹ تک، ص ۶۲۷ تا ۶۲۸)

مذکورہ رباعیوں میں شاعر کی بڑائی کا راز روایت کے مضبوط رشتے سے کھلتا ہے کہ اس نے ماضی سے حال کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے، جہاں من وعن ماضی کی نقل کے بجائے اس کی سوچ کی تبدیلی بھی واضح ہو جاتی ہے اور یہی سوچ اسے منفرد بناتی ہے۔ اسی انفراد کے ساتھ جب وہ حال کی المناکیوں کو بھی رباعی کی زبان عطا کرتا ہے تو تاثیری کیفیت اس کی رباعیوں کو چراغاں کی شکل عطا کر دیتی ہے۔ یہاں ڈاکٹر ظفر کمالی نے اپنی محنت و ریاضت سے ایک ایسی آواز پیدا کی ہے جس میں ماضی اور حال دونوں سنائی دیتے ہیں۔ یہ آواز شاعر کے لطیف جذبات اور متنوع احساسات کو ایک نئی ترکیب میں ڈھال کر پرکشش بنا دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر کا وہ آدمی جو پورے طور پر بیدار ہے اور وہ دماغ جو تخلیق کے عمل سے گزر رہا ہے وہ مختلف جذبات کو اپنے اندر جذب کرتا ہے اور پھر پیش کش کی نئی ترکیب ڈھونڈ لاتا ہے۔

ڈاکٹر ظفر کمالی کے ہاں لسانی اور استعاراتی نظام اپنے معنوی ابعاد کو محیط ہے۔ انھوں نے اپنی فطری صلاحیت اور مطالعات کی وسعت سے جو الفاظ اور استعارے تراشے ہیں وہ ان کی قابلیت، شعری عرفان اور اشیا کی مماثلت کے ادراک کے اشاریے ہیں۔ فن کار جب تک اشیا اور مماثلت کے اسرار سے آگاہ نہیں ہوگا وہ اچھی شعری تخلیق قاری تک پہنچانے میں ناکام رہے گا۔ اسی طرح اگر وہ موضوعاتی سطح پر الفاظ کے استعمال سے ناآشنا ہے تو اس کی تخلیق حسن اور تاثیری روح سے خالی ہوگی۔ موضوعات کی مناسبت سے تفحصِ الفاظ کسی بھی شاعری کو ہماری توجہ کا مرکز بنا دیتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کے یہ خیالات اسی نکتے کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں:

> ''حسن کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کیے

جائیں۔لفظ چوں کہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف اقسام ہیں۔مہیب، پر رعب، سخت، نرم، شیریں اور لطیف۔اسی طرح الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہیں۔بعض نرم، شیریں اور لطیف ہوتے ہیں۔بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہے۔بعض سے درد اور غم گیتی ظاہر ہوتی ہے۔''

چند سطور کے بعد لکھتے ہیں:

''ہر ایک کے لیے جدا جدا الفاظ ہیں۔شعرا میں سے جو اس نکتے سے آشنا ہیں وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہ ان کے کلام کی تاثیر کا بڑا راز ہے۔''(مقالات شبلی، ج ۲، ص ۱۲)

اگر ہم ایک نظر ڈاکٹر ظفر کمالی کی درج ذیل رباعیوں پر ڈالیں تو ان کی تخلیقی شخصیت کے جدلیاتی عمل اور اشعار کی تاثیر کے راز تک رسائی میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

آجائے جو باغی کی بغاوت کا دیار	نخوت کا، رعونت کا، شقاوت کا دیار
تم خون کے دریا میں لگانا غوطے	اور اس کو سمجھ لینا شہادت کا دیار

......

بہتی ہوئی زہریلی ہواؤں کے خلاف	رہتا ہوں زمانے کے خداؤں کے خلاف
جلتی ہوئی بستی پر برستی ہی نہیں	آواز اٹھائی ہے گھٹاؤں کے خلاف

......

برچھی ہیں کبھی اور کبھی خنجر احباب	نفرت کے ہیں زہریلے سمندر احباب
زندہ ہی کسی کو وہ نگل سکتے ہیں	اس دور کے ہوتے ہیں وہ اجگر احباب

......

ٹوٹے ہیں ستم سر پہ جب اولوں کی طرح	وحشت نے پھرایا ہے بگولوں کی طرح
سینے میں چبھے خارِ حوادث ایسے	دل پھوٹ پڑا میرا پھپھولوں کی طرح

......

ہاتھوں میں وہی سنگ لیے پھرتے ہیں	جو دل میں سدا جنگ لیے پھرتے ہیں
ہم لوگ محبت کے پجاری ٹھہرے	آنکھوں میں دھنک رنگ لیے پھرتے ہیں

......

مرجھائے ہوئے اور یہ پتھرائے لوگ	دھتکارے ہوئے وقت کے ٹھکرائے لوگ
مل جل کے کوئی حشر ہی برپا کرتے	مرنے سے کہیں پہلے یہ دفنائے لوگ

ذکر کردہ ان رباعیوں میں الگ الگ موضوع زیرِ بحث آئے ہیں۔زیادہ تر موضوع کا تعلق اس بات پر ہے کہ انسان انھیں جذبۂ حقارت و نفرت سے دیکھے جن کے وجود سے انسان اور سماج دونوں کو نقصان

پہنچتا ہے۔ستم زدگی، جنگ کی کیفیت، دلی عناد، اونچ نیچ کی دیوار، باغی کی بغاوت، انانیت پرستی اور دوست و احباب کی آپسی چپقلش سماج کی کچھ ایسی کیفیات ہیں جن کے پھیلتے دائرے تشویشناک ہیں۔ان سے شاعر کے اندر جس جذبۂ حقارت نے سر ابھارا ہے وہ یہاں رباعیوں کے پیکر میں موجود ہیں، جنھیں پڑھتے ہوئے ہم نہ صرف شاعر کے اس جذبۂ نفرت کو محسوس کرتے ہیں بل کہ ترسیل کے لیے جو لسانی نظام اور ترکیبی ساخت شاعر کے پیش نظر ہے اس پر بھی نظر ٹھہر جاتی ہے۔موضوع اور اظہار کے مابین ذہنی بالیدگی نے ایک حسن پیدا کر دیا ہے۔لفظوں کی توانائی میں انسانی زیست کے ملحقات کچھ اس طرح سما گئے ہیں کہ فن میں طلسم کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے جو لفظوں کے باطنی آہنگ سے ابھرتی ہے اور قاری کے ذہنوں پر مفاہیم کو پھیلاتی چلی جاتی ہے۔شاعر نے سخت اور شیریں الفاظ کے استعمال میں تاثیری روح دوڑا دی ہے۔ابتدا کی تین رباعیوں میں درد اور غمِ گیتی کو الفاظ اور ترکیب کی چستی میں پیش کرنے کی جستجو کی گئی ہے اور آخری کی تین رباعیاں جوش کو ابھار دیتی ہیں۔

ڈاکٹر ظفر کمالی نے اپنی رباعیوں میں جو محاورات استعمال کیے ہیں وہ اپنے پس منظر کے ساتھ رباعی کی دل کشی اور سلاست و روانی میں اضافہ کرتے ہیں۔شاعری میں محاورات کے تہذیبی اور معاشرتی پس منظر کے ساتھ استعمال سے کسی بھی شاعر کے لسانیاتی سطح پر منضبط ذہن کا اندازہ ہوتا ہے۔محاورے اپنے ترکیبی نظام میں ہماری زندگی، سماجی رویہ اور نفسیات کی وسیع کائنات رکھتے ہیں۔شاعر اگر ان کے ہنر مندانہ استعمال کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کی شاعری میں سماج کی مصوری معنی خیز ہوجاتی ہے۔ڈاکٹر ظفر کمالی کی رباعیاں محاوراتی لہجے میں ہمارے سماج کی کچھ ایسی ہی معنی خیز تصویریں پیش کرتی ہیں۔چند رباعیاں ملاحظہ کریں۔

انسان کے پاس کیا ہے سانسوں کے سوا
دنیائے دنی کی چند پھانسوں کے سوا
بننے کو وہ چالاک بہت بنتا ہے
کیا خود کو وہ دے سکتا ہے جھانسوں کے سوا

......

ہے دھند عداوت کی تو چھٹ جائے گی
کائی ہے جمی دل میں تو پھٹ جائے گی
دنیا سے اگر قطع تعلق کرلو
گوشے میں بڑے چین سے کٹ جائے گی

......

دل آزاری ٹھیک نہیں ہے بھائی
پربت بن سکتی ہے تیری رائی
مرہم سے بھی ٹھیک نہیں ہوسکتی
ہوتی ہے اس زخم میں وہ گہرائی

......

جو لوگ اچھلتے ہیں اچھلنے دو انھیں
گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے دو انھیں
ہوجائیں گے کل وقت کے ہاتھوں پانی
آج آگ اگلتے ہیں اگلنے دو انھیں

ان رباعیوں پر غور کیجیے تو محض چار مصرعے کی ترکیب میں زندگی کا کوئی گہرا تجربہ اور انسان کا کوئی داخلی زاویہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یہاں ڈاکٹر ظفر کمالی نے اپنی تخلیقی روح سے کچھ ایسے نکتے پرو دیے ہیں جن سے یہ رباعیاں متحرک ہوگئی ہیں۔ انسان کا کل سرمایہ چند سانسوں سے زیادہ نہیں، مگر وہ اس کھلی حقیقت سے اس قدر غافل ہے کہ ہر آن اپنی دانشوری اور چالاکی کا مظاہرہ کرتا ہے جو دراصل خود اپنے آپ کو جھانسہ دینے سے عبارت ہے۔ دوسری رباعی کے آخری مصرعے نے مجموعی خیال کو بلیغ بنا دیا ہے۔ تیسری رباعی نے دل آزاری سے پیدا ہونے والی ناخوش گواری کو عظیم صداقت میں ڈھال دیا ہے اور چوتھی رباعی اس صداقت کو زاویہ بدل کر آشکار کرتی ہے۔

تلمیح کے سہارے شاعروں نے اپنی شاعری میں معنوی وسعت اور شادابی و شگفتگی پیدا کی ہے۔ کسی تاریخی، تہذیبی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی واقعات سے واقفیت اور پس منظر سے آگاہی تلمیح کے مقاصد ہیں۔ اگر شاعر کا ذہنی افق تابندہ ہے تو زمانی و مکانی حدود و قیود سے ماورا ہو کر اپنے آئینۂ ادراک میں ہر عہد کا عکسِ خیال رخشندہ کر سکتا ہے۔ جہاں ماضی، حال اور مستقبل اپنے مکانی بعد کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ماضی کی وہ کہانی جو حال کی زبانی دہرائی جا رہی ہے اسے علامتوں اور اشارتوں کے سہارے ڈاکٹر ظفر کمالی نے اپنی رباعیوں میں رقم کی ہے۔ کربلا میں اہلِ حق کے بہتر جاں نثار، فرعون و موسیٰ، یعقوب و یوسف اور زلیخا، عیسیٰ اور منصور ماضی کے یہ وہ چہرے اور علامتیں ہیں جو اپنے تناظرات میں تاریخ کے روشن سلسلوں سے مربوط ہیں۔ ان کے تذکروں سے ذہن صدیوں پہلے کی فضا میں گردش کرنے لگتا ہے اور ان سے وابستہ واقعات نگاہوں میں گھوم جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ظفر کمالی نے ایسی رباعیوں میں ماضی سے ارتباط کے ساتھ حال کو بامعنی کر دیا ہے۔

غربت میں اگر ذکرِ وطن ہوتا ہے ۔۔۔ شاداب بہت دل کا چمن ہوتا ہے
پردیس سے لوٹو تو یہی ہو احساس ۔۔۔ یعقوب سے یوسف کا ملن ہوتا ہے

......

ہے دھوپ اگر سخت شجر ہے کہ نہیں ۔۔۔ مظلوم کی آہوں میں اثر ہے کہ نہیں
کیوں خلقِ خدا پر وہ ستم ڈھاتا ہے ۔۔۔ فرعون کو موسیٰ کی خبر ہے کہ نہیں

......

تیور کو کبھی اپنے بدل کر دیکھو ۔۔۔ ظالم کی عدالت میں تو چل کر دیکھو
کچھ لوگ وہاں ہوں گے بہتّر ہی سہی ۔۔۔ تم راہِ شہادت میں نکل کر دیکھو

......

بن جائے مسیحا دمِ عیسیٰ بن جائے ۔۔۔ یوسف کے لیے اس کی زلیخا بن جائے

دارَین کو دامن میں سمیٹے اپنے یہ قطرۂ مے پھیلے تو دریا بن جائے

اب تک تجزیے کے لیے منتخب شدہ رباعیوں میں ڈاکٹر ظفر کمالی کے شعری رویوں کے ساتھ موضوعاتی وسعت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان رباعیوں کے علاوہ بھی کتاب میں موضوعاتی تنوع سے لبریز رباعیاں موجود ہیں، جن میں جذبات و خیالات اور مطالب صحت اور خوبی کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور ان کی شاعری کی دل نشینی و دل پذیری کا احساس ہوتا ہے۔

انھوں نے موضوعات کے دائروں کو بسیط کرتے ہوئے قلم، دل، عزم و حوصلہ، گردشِ دوراں، رجا و امید، حق گوئی و بے باکی، منزل کی جستجو، زندگی کے اسرار، غمِ کائنات، یقین محکم، حوصلوں کی دھوپ، جوش عمل کی تابندگی، زندہ ضمیری، نعمت الٰہی، ایمان، صبر، شکر، فکرِ عقبیٰ، دنیا کی بے ثباتی، موت کا بیان، انسانی الفت ومحبت، جذبۂ ترحم، عصری کرب، معاشرے کے نشیب و فراز، نفرت و عداوت، جھوٹے خداؤں کے صنم کدے، ظلم و عدوان، انسانوں کے مکر و فریب، اہل دُوَل کی انا پرستی، رشتوں کی شکست و ریخت، انسانوں کے قول وعمل کے تضادات، غربت و افلاس، زندگی کے توازن کا فقدان، صداقت پہ لرزتی زبان، جوانی کی دلفریبی، حب الوطنی، لمحات طرب، گوشۂ تنہائی، کتاب، اردو، احسان، ناقدری کے شکوے اور دعائے بزرگاں کی برکت وغیرہ تک پھیلایا ہے اور جن کے اظہار میں وسیع تر معانی کی کائنات سجائی ہے۔ یہاں ذاتی واردات و کیفیات میں قلبِ سوزاں کی حدت و حرارت اور چشم پرنم کے آنسو ایک دل دردمند کا پیغام بن گئے ہیں۔

ان کے فن کی پختگی اور مشاہدات کی وسعت اس وقت متحیر کرتی ہے جب وہ ایک ہی موضوع پر کئی کئی رباعیوں کے سلسلے قائم کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی رباعیاں مرکزی خیال کو مختلف اندازِ بیان اور الگ الگ پیکر میں پیش کرتی ہیں۔ یہاں شاعر اپنی قوتِ احساس و ادراک اور اظہار کی لہروں میں ڈوب کر لفظوں میں روشنی اور فکر میں ندرت وجدت لیے سامنے آتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کے اس عمل میں ہر آن یکسانیت کا خدشہ رہتا ہے کہ جب وہ ایک موضوع پر اظہار خیال کر چکا تو پھر اسی کو محور بنا کر نئے زاویے سے سوچنا ذرا مشکل امر ہے۔ اکثر ہوتا یہ ہے کہ ایک موضوع پر قلم اٹھا کر جب خاموش ہو جاتا ہے تو یہ خوش فہمی سوچ کے دریچے مقفل کر دیتی ہے کہ میں نے اس موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر بڑا فن کار مطمئن نہیں ہوتا۔ ایک ایک پل میں اس کی ذہنی و فکری لہریں اس ایک موضوع کے کئی ساحل سے ٹکراتی ہیں جنھیں گرفت میں لانا آسان نہیں۔ کیوں کہ لہریں اٹھتی ہیں، جوار بھاٹا آتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ظفر کمالی کی ایسی رباعیاں نئے ذائقے اور نئے احساس سے مملو ہو کر ایک موضوع کو مختلف جہات سے سمیٹنے میں کامیاب ہیں۔ یہاں بطورِ استدلال محض دنیا کے حوالے سے مختلف زاویۂ نظر کی عکاس یہ رباعیاں ملاحظہ کریں۔

ہے موجِ بلا خیز رنگیلی دنیا ہوتی ہے بڑی چھیل چھبیلی دنیا
بھاگو کہ نہ چڑھ جائے کہیں اس کا اثر گھس جاتی ہے دل میں یہ نشیلی دنیا
......

خود بگڑے تو کیا اپنی بنالی دنیا ایمان جو بیچا تو کمالی دنیا
ظاہر میں اجالا تو نظر آیا تمھیں باطن کو نہ دیکھا کہ ہے کالی دنیا
......

ہے زہر سے لبریز یہ دنیائے حسیں بے موت مرا وہ جو گیا اس کے قریں
تم سر نہ جھکاؤ کبھی اس کے آگے کیا ناگ پھنی پر کوئی رکھتا ہے جبیں
......

اس جبّہ پہ خاک اور اس دستار پہ خاک بازار پہ اور چشم خریدار پہ خاک
دنیا سے کہو رکھّے اثاثہ اپنا ہم ڈال چکے درہم و دینار پہ خاک

مذکورہ رباعیوں کو اگر کوئی شعری ذوق کی تسکین سمجھے تو شاید وہ شاعر کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے گا۔ایسی رباعیاں کڑی تپسیا اور ریاضت کا نتیجہ ہوتی ہیں جو شعری ذوق سے اوپر اٹھ کر مضطربانہ کیفیت میں تخلیق پاتی ہیں۔ ہر رباعی دنیا کا ایک مرقع لیے اس کے رنگ وروپ پر شاعر کا نظریہ پیش کر رہی ہے۔ یہ کہنے کو تو فنی سطح پر تو چار رباعیاں ہیں جو فن کے سانچے میں موزوں کی گئی ہیں مگر فکری سطح پر غور کیجیے تو نظم کا تسلسل فکری ارتقا کے ساتھ یہاں موجود ہے۔رنگیلی دنیا سے اس فکر کی ابتدا مختلف نظریات کے ساتھ انتہا کو پہنچتی ہے۔ ہر نظریے میں شاعر نے کسی خاص نکتے سے کام لے کر شعری لطافت میں معنوی گہرائی پیدا کی ہے۔لفظ دنیا کو محور بنا کر اس کے اندر بستے کرداروں کی فطرت و جبلت کو ایک منطقی اور فلسفیانہ اظہار کے ذریعے بلیغ اشاروں میں قاری کے روبرو کر دیا ہے۔ایمان فروشوں کے سامنے ظلمت و تاریکی کی تعبیر اور دنیا کی محبت میں پاگل دیوانوں کے لیے دنیا کو نشیلی کہنا اور ناگ پھنی قرار دینا اسی بلیغ اشارے کے غماز ہیں۔ آخری رباعی میں لفظ 'خاک' کے ہنرمندانہ استعمال نے دنیا کے تئیں جذبہ نفرت کو معراج عطا کر دیا ہے۔ ہر آدمی اپنے اندر جھانک کر دیکھے کہ اس 'خاک' کے اظہار کے لیے اس میں کتنی قوتِ ارادی ہے تو اس رباعی کی معنویت اس پر آشکار ہو جائے گی کہ ایسے جذبوں کو پیش کرنا آسان نہیں۔ ایسے جذبات کسی مرشد کے آستانے پر جبیں سائی اور مکاشفاتی کیفیت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔اس رباعی کو پڑھتے ہوئے ہمارا ذہن شاعر کی حقیقی زندگی کی طرف اچانک مڑ جاتا ہے، تو وہاں بھی ہمیں خوش گوار حیرت ملتی ہے کہ شاعر نے اس دنیا کو جس نظریے سے دیکھا اور برتا ہے یہ اسی نظریے کا شعری اظہار ہے۔ وہاں نہ کسی جبّہ اور دستار کی تمنا ہمیں دکھائی دیتی ہے اور نہ دنیا کے اثاثے پر مر مٹنے اور اس کے زہر بھرے پیالے کو پینے کی آرزو انگڑائی لیتی

ہے۔شاعر کی فکر کا جو عملی اظہار ان کی زندگی سے وابستہ ہے یہ رباعیاں اس کی بہترین مثال ہیں۔

'رباعیاں' میں ڈاکٹر ظفر کمالی نے ۱۵۰/رباعیاں ساقی اور اس کے تلازمات کو محور بنا کر کہی ہیں۔ ساقی کو علامت کے طور پر اردو کے اکثر شاعروں نے برتا ہے اور معنوی نیرنگیوں کی ایک وسیع کائنات سجائی ہے۔شاعروں نے ساقی کے تلازمات میں میخانے، پیر مغاں، بادہ و ساغر، واعظ و محتسب اور زاہد و رند کو اپنے افکار و تجربات اور معتقدات کا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ان علائم کے حریری نقاب کی حجابی و مستوری میں دنیائے معانی کے جو گوہر پوشیدہ ہوتے ہیں ان تک رسائی نقاب کشائی کے عمل سے گزرے بغیر ممکن نہیں۔ زندگی کے کون کون سے رموز و نکات اور صداقتیں ان علائم کے پیچھے پوشیدہ ہیں ان کا عرفان ظاہر سے نہیں باطن میں اتر کر ہوگا۔ یہاں معاملہ معکوس ہوتا ہے۔لفظوں کے مد و جزر اور ارتعاشی لہروں پر گرفت کے بغیر شاعر کے وہ احساسات و جذبات منکشف نہیں ہوتے جن کا اظہار شاعر کا مقصود ہے۔ یہاں عام اور سطحی ذہن ساقی و شراب اور جام و سبو کی مستی ہی کو اصل مقصود سمجھ بیٹھتا ہے۔

ڈاکٹر ظفر کمالی کے ہاں ساقی میں سارا معاملہ معکوس ہے۔انھوں نے اپنے باطنی احساسات اور خارجی مشاہدات کو جس ساقی و رند کے پیکر میں پیش کیا ہے، وہ مقدس، مطہر اور منزہ ہے، جہاں شاعر ساقی کے عشق میں تحلیل ہو گیا ہے اور مدعا ذات سے شروع ہو کر کائنات تک پھیل گیا ہے۔ بات روزِ اول ذاتی طور پر بادۂ توحید کے پینے سے شروع کی اور اہلِ دنیا کو وصلِ ساقی کی مداومت پر تلقین کرتے ہوئے ختم کی۔ان رباعیوں میں تخلیقی حسیت اور ذہنی اپج کا خوش گوار احساس ہوتا ہے اور تنوع و تازہ کاری کے ساتھ تجربے سامنے آتے ہیں۔شاعر کی نظر اقبال کے ساقی نامہ پر بھی ہے اور غالب کے میخانے پر بھی۔وہ مے جو اقبال کے ہاں ضمیرِ حیات کی روشنی، کائنات کی مستی، سوز و سازِ ازل اور رازِ ازل کی گرہ کشائی کا استعارہ ہے وہ ظفر کمالی کے ہاں چھلکی پڑ رہی ہے۔

کیا جامِ طرب تھا جو پیا روزِ ازل
واللہ عجب تھا جو پیا روزِ ازل
اک نور کی چادر سی تنی تھی دل پر
پر گھونٹ غضب تھا جو پیا روزِ ازل

......

اک بات بتائی تھی ہمیں روزِ ازل
اک راہ سجھائی تھی ہمیں روزِ ازل
تاحشر نہ ٹوٹے گا نشہ اس کا ظفرؔ
ساقی نے پلائی تھی ہمیں روزِ ازل

......

اقرار کی تجدید ہے چھلکاتے چلو
ساقی کی بھی تاکید ہے چھلکاتے چلو
ہوگا نہ کسی حال میں کوزہ خالی
یہ بادۂ توحید ہے چھلکاتے چلو

علامہ اقبال رازِ ازل کے عرفان کے لیے ساقی سے پردہ اٹھانے اور پھر ممولے کو شہباز سے لڑانے کے خواہاں ہیں اور کوہِ طوٗر پر کوئی کلیم انھیں تجلّی کا منتظر نظر آتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر ظفر کمالی کے ہاں معاملہ دیگر ہے، ان کے ہاں اس مے کو عقیدت سے پینے والا پل میں اس راز کے اسرار سے آگاہ ہو جاتا ہے اور کوہِ طور خود جلوہ لیے اس کی نگاہوں میں اتر آتا ہے۔

مستوٗر ہے اس مے میں کمالِ اَزَلی ہوتا ہے نصیب اس سے وصالِ اَزَلی
پیتے ہیں عقیدت سے جو پل میں ان پر کھل جاتے ہیں اسرارِ کمالِ اَزَلی
......
جب ہوتا ہوں مخمور اتر آتا ہے آنکھوں میں عجب نور اتر آتا ہے
اس مے کی بدولت ہی مرے دل میں ظفرؔ خود جلوہ لیے طوٗر اتر آتا ہے

ساقی کی ایمائیت و رمزیت میں ڈاکٹر ظفر کمالی کے دل کے پھپھولے پھوٹے ہیں۔ سینوں کے داغ جل اٹھے ہیں۔ سانسوں کی گھٹن، ذہنوں کے ہیجان اور ناامیدی میں امید کی کرن طلوع ہوتی ہے۔ انھوں نے ساقی میں فطرت کی نیرنگیوں کے جلوے دیکھے ہیں۔ قطرے میں سیلاب اور ساغر میں مہتاب کا عکس پایا ہے۔ روح کی سرشاری، حقیقت کا عرفان، معانی کا دفتر، عرش تک پرواز، نمازِ الفت، پیچیدہ سوالات کا حل، الفت، طہارت، تقویٰ، ہستی کے نہاں رازوں کا انکشاف، عشق کی شدت اور ذات کی قلندری و مستی کی بہت سی تصویروں کو ڈاکٹر ظفر کمالی نے ساقی کے تلازمات میں منعکس کر کے حالات و حوادث اور وارداتِ قلبی کی نئی جہتیں روشن کی ہیں اور درد کی ہواؤں اور آج کی مسموم فضاؤں کی اضطرابی عبارتیں لکھ دی ہیں۔

دل سرد سرِ شام ہوا جاتا ہے دشوار مرا کام ہوا جاتا ہے
کیوں اس میں حلاوت وہ نہیں اب ساقی کیوں تلخ بہت جام ہوا جاتا ہے
......
اب جان ہے انسان کی سستی ساقی محفوظ کہاں کوئی بھی بستی ساقی
ذہنوں میں دہکتے ہوئے انگارے ہیں آئی ہے عجب فکر میں پستی ساقی
......
یہ کس نے کہا تم سے کہ زاہد بن جاؤ پینا ہے برا چھوڑ دو عابد بن جاؤ
ایمان اسی مسلکِ مے پر لاکر تم ساقیِ گل فام کے قاصد بن جاؤ
......
جب ابر اٹھے جھوم کے توبہ ٹوٹے صدقے بُتِ معصوٗم کے توبہ ٹوٹے

گردن کی صراحی سے جو مل جائے شراب
ہونٹوں سے اسے چوُم کے توبہ ٹوٹے

......

دن نے نہ ہمیں رات نے دیوانہ کیا
نے کشف و کرامات نے دیوانہ کیا
ہم اہلِ خرد تھے نہ رہے قابو میں
ساغر کے طلسمات نے دیوانہ کیا

......

ہم گاتے ہیں گائیں گے ترا گن ساقی
بس ایک گزارش ہے اسے سن ساقی
لوگوں کو ضرورت ہے جہانِ نو کی
بے چین ہیں سب بول بھی دے کن ساقی

کتاب کے آخر میں شخصی رباعیاں بھی درج ہیں۔ احمد جمال پاشا، پروفیسر حنیف نقوی، علامہ ناوک حمزہ پوری، پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، کوثر سیوانی، قمر سیوانی اور ڈاکٹر التفات امجدی یہ وہ شخصیات ہیں جنھیں نگاہ ودل میں بسا کر ان کے شعری خاکے کھینچے گئے ہیں اور لفظوں کے فسوں میں ان کے کردار وافعال کو تاثیری کیفیت سے لبریز کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے ہر ایک کی ان مخصوص صفات کو مطمحِ نظر بنایا جن سے شخصیت بھی سامنے آئے اور قاری کے دلوں میں تقدس کا چراغ بھی ضوفشاں ہو۔ ظرافت کا امام، تحقیق کا حاصل، رباعی کا استاد، علم کے علمبردار، تنقید کے دلاور، فن کا ماہر اور اردو کا قلندر جیسے مرکب صفاتی الفاظ کے ذریعے شخصیات کے جلال و جمال اور قدر ومنزلت کو آئینہ دے دیا گیا ہے۔ پھر ان کے خلوص ووفا، انسانی دردمندی، احترام آدمیت، علم کی حرمت و پاسداری، ایثار وقربانی اور عقیدت ومحبت کے اظہار میں شاعر کے جذبات کی صداقت اور احساس کی خوشبو پھیل گئی ہے۔ رباعی کا حسن اس پر مستزاد ہے۔

التفاتؔ امجدی ان کے عزیزوں اور شاگردوں میں شامل ہیں اس لیے یہاں تخاطب کی لے بدل گئی ہے۔ اقبال کے شاہین کے پر ہونے کی تلقین، استاد کے فیضان کی یاددہانی، ادب کی برسات سے اجتناب اور صدف میں گہر پیدا کرنے کا سبق دیتے ہوئے دعائیہ کلمات اور نیک خواہشات ان کے تعلق سے کہی گئی رباعیوں کے اختصاص ہیں۔ کچھ رباعیاں ملاحظہ کریں۔

زندہ ہے جو افکار کا جادو بن کر
روشن ہے میری آنکھوں میں آنسو بن کر
اے گردشِ ایام کہاں جاتی ہے
وہ پھیل گیا دہر میں خوشبو بن کر
(احمد جمال پاشا)

تحقیق کے تدوین کے حاصل نقوی
زیبا ہے کہو ان کو جو فاضل نقوی
گہری ہے نظر ان کی کئی گوشوں پر
غالبؔ کے مگر عارفِ کامل نقوی
(حنیف نقوی)

ڈاکٹر ظفر کمالی کی شعری کائنات کے آفاق و جہات میں وسعت وتنوعات کی دھنک رنگ اور اسلوب کا انفرادی نظام ہے۔انھیں جتنی محبت انسان سے ہے اتنا ہی ان کا رشتہ اقدار سے مستحکم ہے۔وہ نہ صرف اقدار کے حامی ہیں بل کہ ان کی اشاعت بھی ان کی شاعری کا محور ہے۔انھوں نے انسانی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کے نشیب وفراز کا عرفان حاصل کیا ہے۔بدلتے سماج،تبدیل ہوتی کائنات، روشن ہوتے نئے آفاق اور طلوع ہوتے نئے جہان ان کے شعور کا نہ صرف حصہ ہیں بل کہ تعمیری ومثبت پہلو پر ان کی گہری نظر ہے۔ان کی رباعیوں میں روح کا کرب اور زخمی دل کی سرخی نظر آتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ سماج اور انسانوں سے شاعر کے دل کو ایسی ٹھیس پہنچی ہے کہ وہ دنیا کے ہنگامے اور شوریدہ سری سے کنارہ کش ہوکر ذات کے خول میں سمٹ آیا ہے اور گوشۂ تنہائی کو جشنِ زندگی کی محفل بنادیا ہے، جہاں آنسو بھی ہیں اور آہیں بھی،کرب واضطراب بھی ہے اور نشاط وسرور بھی،تلخی بھی ہے اور مسکراہٹ بھی۔

'رباعیاں'ان کی رباعیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔فن کی جو اٹھان یہاں سے ہوئی ہے وہ ان کے دوسرے مجموعے'رباعیاتِ ظفر'اور رباعیوں کے دیوان'خاکِ جستجو'میں مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ رباعی کے باب میں ڈاکٹر ظفر کمالی ہمیشہ اپنی انفرادی آواز،لب ولہجہ،لَے اور فنی پختگی سے پہچانے جائیں گے۔آنے والا کل میزانِ نقد میں انھیں تول کر ان کی عظمت کے فیصلے سنا دے گا!!

☆☆☆

مضامین، مقالات اور تخلیقات کے لیے ضروری ہدایات:

ا۔مضمون خالص تحقیقی،تنقیدی،علمی وادبی اور غیر مطبوعہ ہو۔کسی رسالے میں اشاعت کی غرض سے نہ بھیجا گیا ہو۔اگر پندرہ دن کے بعد بھی مقالے کی منظوری اشاعت کی اطلاع موصول نہ ہو تو کسی اور مجلّے میں اشاعت کے لیے بھیجا جا سکتا ہے۔

۲۔مضمون میں تلخیص کے ساتھ کلیدی الفاظ کا ہونا لازمی ہے۔تلخیص تقریباً ڈھائی سو الفاظ پر مشتمل ہو۔مضمون کم از کم تین ہزار اور زیادہ سے زیادہ چھ ہزار الفاظ پر مشتمل ہو۔اگر مضمون کی ضخامت چھ ہزار الفاظ سے زیادہ ہوگی تو اسے قسطوں میں شائع کیا جائے گا۔

۳۔اگر تخلیق کار حضرات اپنی کوئی تخلیق جیسے غزل،مثنوی،قصیدہ،نعت،افسانہ،انشائیہ وغیرہ ارسال کر رہے ہوں تو براہ کرم چند سطروں میں اپنا تعارف بھی لکھ کر بھیجیں۔(ادارہ)

☆☆☆

ڈاکٹر محمد قیصر
شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، رابطہ نمبر:9411800425

عہدِ مغلیہ: فن خطاطی و مصوری کا عہدِ زرّین

تلخیص:

عہدِ مغلیہ (۱۵۲۶-۱۸۵۷ء) میں فن خطاطی اور مصوری کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس دور کے حکمراں، خاص کر بابر، ہمایوں، اکبر، جہاں گیر اور شاہجہاں، فنون لطیفہ کے بڑے دلدادہ تھے۔ اس دور میں فارسی، عربی اور سنسکرت میں خطاطی کے ساتھ ساتھ مصوری کو بھی فروغ ملا۔ عہد مغلیہ میں خطاطی کو اسلامی ثقافت اور مذہبی تعلیمات کے اظہار کا اہم ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں نستعلیق اور نسخ جیسے خطوط بہت مقبول ہوئے، جنھیں قرآن مجید، کتب، اور سرکاری دستاویزات میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اکبر اور جہاں گیر کے دور میں ایرانی خطاطوں کو خاص طور پر دربار میں بلایا گیا، جنھوں نے ہندوستان میں خطاطی کے فن کو مزید نکھارا۔ خطاطی کو نہ صرف کتب کی تزئین و آرائش کے لیے بلکہ عمارات کی دیواروں پر بھی استعمال کیا گیا، جیسے تاج محل اور قلعہ آگرہ۔ اس کے علاوہ اس دور میں فن مصوری کو بھی کافی عروج ملا، خصوصاً درباری مصوری میں یہ فن بہت مشہور ہوا۔ مغل حکمرانوں نے ایرانی اور مقامی ہندی روایات کو ملا کر ایک منفرد طرز کی مصوری کو فروغ دیا جسے 'مغل مصوری' کہا جاتا ہے۔ اکبر کے دور میں خاص طور پر مصوروں کو بلا کر ایک 'کتب خانہ' قائم کیا گیا، جہاں ہند-ایرانی اور ترک مصور کام کرتے تھے۔ مغل مصوری کے موضوعات میں درباری زندگی، شکاری مناظر، مذہبی و تاریخی کہانیاں اور بادشاہوں کے پورٹریٹ شامل تھے۔ جہاں گیر نے فطرت اور پرندوں کی تصویروں میں دلچسپی لی اور حقیقت پسند مصوری کو فروغ دیا۔ مغلیہ دور کی خطاطی اور مصوری نے بعد کے ادوار پر بھی گہرے اثرات چھوڑے۔ اس عہد کے فن پارے آج بھی ہند-اسلامی فنون کے بہترین امتزاج کی مثال سمجھے جاتے ہیں۔

کلیدی الفاظ:

عہد مغلیہ، بابر، ہمایوں، اکبر، جہاں گیر، شاہجہاں، خطّاطی ومصوّری، کتب خانہ، اسلامی خطاطی، خوش نویس، خط بابری، خط ثلث، خط نسخ، نستعلیق، شکستہ، خط شیفتہ، درس گاہیں، تزئین کاری۔

برصغیر کو خطّاطی اور مصوّری کے میدان میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔ دنیا کی قدیم ترقی یافتہ اقوام کی طرح ہندو پاک میں بھی یہ فن زمانہ قدیم سے عہد بہ عہد ترقی کی منازل طے کرتا رہا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل یہاں پر متعدد قومیں آباد رہیں اور اسی قدر زبانیں بھی بولی جاتی رہیں اور ان زبانوں کے رسم الخط بھی الگ الگ علاقوں میں رائج تھے۔ کچھ محققین کی یہ رائے ہے کہ یہ رسم الخط آرامی رسم الخط سے مشابہ تھے، جو کہ بابل اور ایران میں قدیم زمانے میں رائج تھا۔ ایران اور ہندوستان کے تجارتی تعلقات زمانہ قدیم سے ہیں۔ اس وقت جو لوگ تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے وہ اپنے ساتھ اس رسم الخط کو بھی لائے جو وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہا۔

ہندوستان میں اسلامی خطاطی کا فن مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوا۔ مسلمان وسط ایشیا اور ایران سے ہندوستان میں وارد ہوئے اور وہ اپنے ساتھ اس فن کو بھی لائے۔ سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۲۲ء میں لاہور کو فتح کیا اور یہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ قیام لاہور میں اس نے اہل علم، خطاطوں اور شعرا کی بہت قدر و منزلت کی اور کثیر تعداد میں دولت اہل علم لوگوں پر صرف کی۔ اس بات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محمود غزنوی کے قیام لاہور میں کس قدر اعلیٰ پایہ کے مخطوطے اور نسخے معرض وجود میں آئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس دور میں لاہور میں باقاعدہ دیوانی دفتر بھی قائم کیا گیا جس کی وجہ سے لاہور میں اس وقت کاغذ، قلم دوات اور دیگر تحریری ساز و سامان بھی دستیاب ہوئے۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں باقاعدہ مدارس بھی قائم کیے۔ سلطان محمود کے بعد اس کے جانشین سلطان مسعود نے بھی اس علاقے کی ترویج اور ترقی کی طرف خاص توجہ کی۔ وہ بھی علما، فضلا کا قدر دان تھا اور اس کے دربار میں بھی کافی تعداد میں خطاط موجود تھے۔ ابتدائی غزنوی دور میں خط کوفی، ثلث اور تعلیق کے نمونے قرآنی نسخوں اور دیگر کتابوں، کتبوں اور عمارتوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس عہد کی عمارتیں، سکے اور کتب غزنوی دور کی خطاطی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس زمانے کا مشہور سیاح، مورّخ اور فلسفی ابوریحان البیرونی بھی مسعود کے دربار سے وابستہ تھا۔ غزنوی دور میں حمید الدین مسعود، ابراہیم بن سلطان مسعود، جمال الدین لاہوری، نجیب الدین ابوبکر ترمذی معروف خطاط گزرے ہیں۔ غلامان، خلجی، تغلق، سادات اور لودھی خاندان نے بھی اس فن کی بہت قدر و

منزلت کی۔ بعض سلاطیں خود بھی اعلیٰ پایہ کے خطاط تھے۔ان سلاطین کے عہد میں تعمیر ہونے والی عمارات پر خطاطی کو ہمیشہ نمایاں اہمیت دی گئی۔اس کے علاوہ قرآنی نسخوں کو نہایت خوب صورت انداز میں سونے اور چاندی کے ساتھ نقاشی کر کے تحریر کیا گیا۔قاضی مغیث الدین، حسن جرجیس، ملک علاءالدین، شہاب الدین، عبداللہ ہروی، یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی، مولانا جمالی کمبوہ، شیخ گدائی کمبوہ ان ادوار کے مشہور خطاط تھے۔اس دور کی مشہور عمارات میں 'قطب مینار' اس زمانے کی خطاطی اور طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کی زیادہ تر عمارات زمانے کی نذر ہو گئیں۔

ہندوستان میں مغلیہ عہد کی بنیاد ظہیر الدین بابر نے ۱۵۲۶ء میں رکھی۔مغلیہ دور علوم وفنون کے اعتبار سے ایک تابناک دور تسلیم کیا جاتا ہے۔اس دور میں فنِ خطاطی کو زیادہ ترویج اور ترقی ملی۔ بابر کو جنگی حکمتِ عملی اور تلوار زنی کے ساتھ ساتھ دیگر علوم سے بھی گہرا شغف تھا، جن میں خطاطی اور مصوّری کا فن بھی شامل تھا۔میر علی، بابر کے دربار کا مشہور خطاط تھا، جس نے شہزادہ ہمایوں کے حکم پر ۱۵۳۰ء میں 'تزکِ بابری' کو مزین کیا اور جب ہمایوں تخت نشین ہوا تو اس نے میر علی کو اس کے صلے میں دربارِ شاہی سے انعام و اکرام سے نوازا۔

عہدِ بابر میں صنعت وحرفت، زراعت، تجارت، علوم وفنون، معاشرت اور خوانگی زندگی میں کافی ترقی ہوئی۔اس دور میں علما، فضلا، شعرا، ماہرین فنِ تعمیر، خطاطوں اور مصوروں کو اعلیٰ مقام دیا گیا، جس کی بدولت مغلیہ دور میں ان اہلِ فن نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے۔ان بادشاہوں نے خطاطوں کو جاگیریں اور منصب عطا کیے، جس کی وجہ سے خطاطوں کی ایک کثیر تعداد اس دور میں نظر آتی ہے۔ہندوستان میں خطِ نستعلیق کا اجرا بھی بابر کی فتح کے بعد ہی ہوا۔علاوہ ازیں اس کو فنونِ لطیفہ سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ بابر جب فاتح بن کر ہندوستان وارد ہوا تو وہ بحیثیت بادشاہ! ہندوستان میں ہی مقیم ہو گیا۔اس کے دربار میں ایران اور وسط ایشیا کے علما، فضلا، ماہرین فنِ خطاطین کی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ شیخ زین الدین، مولانا بقائی، مولانا شہاب الدین معمائی کا شمار اس عہد کے مشہور خطاطین میں ہوتا ہے۔ بابر خود بھی خوش نویس تھا اور اس کا سلسلۂ شاگردی میر علی تبریزی تک پہنچتا ہے۔ بابر بذاتِ خود 'خطِ بابری' کا موجد تھا جو کہ 'خطِ نسخ' کی ہی ایک جدید روش تھی۔

بابر نے اپنی حکومت میں ترقی کی جو داغ بیل ڈالی تھی ہمایوں نے اس کی تکمیل میں بھرپور سعی کی۔ اس عہد کے نامور خوش نویس سلطان علی تھے۔عہدِ اکبری میں اس کو باشاہ کی طرف سے افضل خاں کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ہمایوں جب ایران میں مقیم تھا تو شاہ طہماسپ صفوی نے اس کی دلجوئی کے لیے نادر و نایاب کتابیں مہیا کی تھیں۔ جب ایران سے ہندوستان واپس آیا تو اپنے ہمراہ دو مصور اور کاتب سید میر علی

تبریزی اور خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کو بھی لایا، جس نے عہدِ اکبر میں ایرانی روایات پر فنِ مصوّری کی بنیاد رکھی اور اعلیٰ کتب خانہ، فنِ مصوری اور تزئین کاری کا ایک دبستان بھی قائم کیا۔

ہمایوں کے عہد تک خطاطی اور مصوری کا فن زیب و زینت کی اشیا اور قدرتی مناظر تک محدود تھا، لیکن بادشاہ اکبر کے عہد میں اس فن کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اس عہد میں عربی اور سنسکرت کُتب کے بڑے پیمانے پر فارسی زبان میں تراجم ہوئے لہٰذا ان قلمی نسخوں کے مسوّدے تیار کرنے کے لیے خطاطوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور ساتھ ہی فنِ خطاطی کے لیے کچھ اصول بھی مرتب کیے گئے جو کہ معمولی تبدیلی کے ساتھ آج بھی رائج ہیں۔ مولانا عبدالعزیز، میر حسین، محمد حسین کشمیری اور نظامی قزوینی عہدِ اکبری کے مشہور خطّاط تھے۔

جلال الدین محمد اکبر کا عہد حکومتِ مغلیہ کا زرین عہد شمار کیا جاتا ہے۔ اس دور میں کئی نامور خوش نویس اور مصور منظرِ عام پر آئے جن کو اکبر نے ان کے فنی کمالات کی وجہ سے جاگیریں، مناصب اور مختلف خطابات سے سرفراز کیا اور دفتر انشا میں مختلف عہدوں پر مقرر کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس دور کے عظیم خطاط حسبِ ذیل ہیں۔ محمد اصغر ہفت قلم، محمد حسین کشمیری زرین اکبر شاہی، خواجہ عبدالصمد شیریں قلم، خواجہ ابراہیم حسین، عنایت اللہ شیرازی، مظفر علی، راجا ٹوڈرمل کھتری، مرزا عبدالرحیم خان خاناں، مرزا ایرج، عبدالرحیم عنبریں قلم، مرزا عزیز کوکلتاش، رائے منوہر، میر معصوم کابلی، عبدالقادر اخوند، حسین احمد چشتی، علامہ مفتح اللہ شیرازی، ملا علی مہر کن۔

بادشاہ اکبر ہی کے عہد میں قلعہ آگرہ کے مثمن برج میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا اور وہیں مغل عہد کی تمام کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ اہلِ قلم حضرات اس شاہی کتب خانہ میں اپنی تصنیفات ارسال کرتے تھے۔ یعنی فتوحاتِ اکبری کی بدولت 'خزانہ عامرہ' یا کتاب خانہ ترقی کرتا رہا۔ فتح گجرات کے موقع پر کافی کتابیں ملی تھیں جو اعتماد خاں کے توسط سے حاصل ہوئی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس کتب خانہ میں چوبیس ہزار کتابیں جمع ہو گئیں۔ اس کے علاوہ اکبری عہد کے امرا ابوالفضل، عبدالرحیم خان خاناں اور عزیز کے ہاں جو کتابیں موجود تھیں وہ اعلیٰ کاتبوں نے لکھی تھیں۔ جہاں گیر کے عہد میں بھی ایک عظیم الشان کتاب خانہ قائم تھا۔ مکتوب خاں اس کا مہتمم تھا۔ جہاں گیر سفر و حضر میں کتابیں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اسی طرح عہد شاہجہاں میں بھی اکثر خطاط مہتمم کتاب خانہ کے فرائض انجام دیتے تھے جن میں آقا عبدالرشید دیلمی شامل ہیں۔ البتہ عہد عالم گیر میں یہ شعبہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی بدل گیا تھا۔

نورالدین جہاں گیر مغل بادشاہ اپنے باپ اکبر اعظم کی وفات کے بعد اکتوبر ۱۶۰۵ء میں بہ عمر ۳۸ سال، بمقام آگرہ تخت نشین ہوا اور ابوالمظفر نورالدین جہاں گیر بادشاہ لقب اختیار کیا۔ اسی نیک ساعت

میں سونے اور چاندی کے مختلف اوزان کے سکے مسکوک کیے گئے اور ان پر خطِ نستعلیق میں اشعار وغیرہ اندراج کر کے خط کی سرپرستی کی اور خواجہ شریف پسر خواجہ عبدالصمد شیریں قلم، جو بہت بڑے خطِ نستعلیق کے ماہر تھے، انھیں امیر الامرا کے خطاب اور وکالت کے جلیل القدر عہدے سے سرفراز کیا گیا۔ خواجہ عبدالصمد ہمایوں کے ہمراہ ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کے علاوہ عہدِ اکبر کے مشہور خوش نویسان محمد حسین کشمیری زریں قلم، عبداللہ مشکیں قلم اور عبدالرحیم الہروی نے گراں قدر خدمات انجام دیں اور عہدِ جہاں گیری میں اپنے اپنے عہدوں پر بدستور فائز رہے۔ شاہجہاں کا عہدِ فن وثقافت میں بلند مقام رکھتا ہے کیوں کہ اس زمانے میں فنِ تعمیر کے مشہور شاہکار 'تاج محل' کی تعمیر ہوئی۔ اس عمارت پر جو قرآنی آیات خطِ ثلث میں بصورت کتابت لکھی گئیں وہ اس دور کی فنِ خطاطی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور میں بے شمار خطی نسخے بھی وجود میں آئے۔ سید احمد رامپوری اپنی تصنیف 'خط کی کہانی تصویروں کی زبانی' میں لکھتے ہیں:

> ''تاج محل آگرہ اپنی عدیم النظیر ڈیزائن، بلند کرسی، تعمیری حسن تناسب کی وجہ سے تمام عالم اسلامی کی تعمیرات میں لافانی شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ ماہرین تعمیرات تاج محل کے ہر پہلو پر غور وفکر کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز اس عمارت کی بلند و بالا محرابات کی خطاطی ہے۔'' (ص ۱۳۵)

شاہجہاں خود بھی خطِ نستعلیق کا باکمال استاد تھا۔ 'تذکرۂ خوش نویسان' میں مولانا غلام محمد ہفت قلمی دہلوی شاہجہاں کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''شاہزادہ خرم یعنی شاہ جہان بادشاہ در تحصیل علم عربی و فارسی و خطِ نستعلیق نہایت مہارت داشتند۔'' (ص ۹۱)

اس دور کی اہم یادگار خطِ شکستہ بھی ہے۔ شاہجہاں بادشاہ کے وزیر سعداللہ خان نے خطِ شکستہ کی اشاعت میں خاص توجہ کی جس کی بدولت یہ خط اس دور میں مقبول ترین خط بن گیا جو کہ بعد میں بھی ترقی کرتا رہا۔ میر محمد صالح، عبدالحق شیرازی، عبدالباقی حداد، میر مومن مشکیں رقم، محمد عارف رقم، مولانا عصمت اللہ، حافظ کلو خان، محمد افضل، محمد عسکری، ملا باقر کشمیری، مقصود علی، میر محمد کاشی، حافظ عبداللہ، شکر اللہ، محمد مقیم، حکیم رکنا کاشی، محمد مراد شیریں قلم، شہزادہ دارا شکوہ، میرزا محمد جعفری، جلال الدین یوسف، شرف الدین عبداللہ، مولانا منیر لاہوری، ابوالفیض، ابوالفتح، عہدِ شاہجہانی کے اہم خطاطین میں شمار ہوتے ہیں۔

شاہجہاں کے بعد محی الدین اورنگ زیب تخت نشین ہوا۔ اورنگ زیب عالم گیر علم وفضل سے موصوف اور خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے یہ فن کم عمری میں ہی سیکھ لیا تھا۔ اس کے

علاوہ اورنگ زیب حافظ قرآن بھی تھا۔ خط شکستہ اور ہندی خط میں بھی ماہر تھا۔ اورنگ زیب کے دور کے مشہور خطاطین میں شمس الدین علی خان جواہر رقم، ہدایت اللہ خان زرین رقم، مرزا جعفر، حافظ نوراللہ، مرزا شکراللہ، منشی کسل سنگھ، منشی محبوب رائے، نواب مرید خان تھے۔ اس عہد میں عبداللہ جو کہ عبدالباقی کے نام سے مشہور تھے آخری دور میں تمام نسخ نویسوں سے بازی لے گئے، انھوں نے اس خط کو ایک نیا رنگ روپ اور زیبائش بخشی۔ ہندوستان میں آکر انھوں نے شہزادہ اورنگ زیب کے سامنے ۳۰۰/اوراق پر مشتمل قرآن کریم کا نسخہ اور دیگر صحیفے پیش کیے، جس کے صلے میں اس کو 'یاقوت رقم' کا خطاب ملا، اس کے بعد یہ اپنے وطن واپس چلے گئے۔ انھوں نے اپنے چند شاگرد بادشاہ کی فرمائش پر دربارِ شاہی میں ہی چھوڑ دیئے۔ ان شاگردوں میں سے اکثر نے دربارِ شاہی سے معزز خطابات حاصل کیے۔ انہی خطاطوں میں آخری دور میں محمد حارث تھے جن کو 'یاقوت' کا خطاب ملا۔

اورنگ زیب عالم گیر کے بعد، محمد معظم بہادر شاہ، فرخ سیر، ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ، ابوالمظفر جلال الدین ملقب بہ شاہ عالم، ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی، عزیز الدین عالم گیر ثانی، ابوظفر بہادر شاہ ثانی یکے بعد دیگرے مغلیہ تخت پر مسند نشیں ہوئے۔ ان کے ادوار میں بھی اس فن کی ترقی کی راہیں ہموار ہوتی رہیں۔ فرخ سیر کو تیس سال حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اس کے دور کے مشہور خطاط محمد افضل لاہوری، محمد مقیم، میر محمد موسیٰ، پریم ناتھ کھتری، مولوی حیات علی، نواب مظہر خان، محمد حفیظ خان، پنڈت شنکر ناتھ ہیں۔ قاضی عظمت اللہ خان شاہ عالم کے عہد کے مشہور خطاط اور خطِ نسخ کے استاد ماہر مانے جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں میر گدائی، حافظ ابوالحسن، میر کرم علی، حافظ مسعود اور عنایت اللہ بہت مشہور تھے۔ ان کے علاوہ فیض اللہ خان، عباداللہ خان، محمد میر، میر غلام علی اور آخوند عبدالرسول قندھاری بھی اسی زمانے کے مشہور خطاط تھے۔ قاضی عصمت اللہ خان کو خطِ نسخ یاقوت میں تمام خوش نویسوں سے زیادہ فوقیت حاصل تھی، اور وہ خطِ نسخ یاقوت کو بہتر لکھتے تھے۔ انھوں نے خطِ نسخ کو نئی ترکیب، نئے اسلوب اور نئے ڈھنگ سے لکھا۔

جہاں گیر اور شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں بھی اس فن کی ترویج و ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں۔ شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں تعمیراتی کام زیادہ ہوا جس کی وجہ سے یہ فن کتابوں سے نکل کر محلوں اور عمارتوں کی زیب و زینت کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔

عہدِ مغلیہ میں خطِ ثلث، نسخ، نستعلیق، بہار، شکستہ، دیوانی اور خطِ شیفتہ استعمال کیے جاتے تھے۔ عہدِ مغلیہ کے تقریباً سبھی بادشاہوں بابر، ہمایوں، جہاں گیر، شاہجہاں، شہزادہ داراشکوہ، اورنگ زیب عالم گیر اور بہادر شاہ ظفر خود بھی اعلیٰ پایہ کے خطاط تھے۔ اکبر بادشاہ اگرچہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر وہ اہلِ فن کا بہت بڑا

قدرداں تھا۔اس دور میں شہزادے اور شہزادیوں کو اس فن کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ بابر کی بیٹی گلبدن بیگم، نور جہاں ملکہ جہاں گیر اور شہزادی زیب النسا اس دور کی زبردست خطاط تھیں۔

سرزمین ہند میں اسلامی خطاطی کی اولین درس گاہ سندھ تھی۔محمد بن قاسم کی فتح کے بعد یہاں پر درس گاہیں اور مساجد قائم ہوئیں جن کو کتبات سے مزین کیا گیا۔اس کے ساتھ ساتھ یہاں تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری ہوا اور علما، فضلا اور صوفیائے کرام یہاں آ کر آباد ہو گئے، ان میں اکثر خطاط بھی تھے۔ اس دور میں یہاں پر کوفی خط کندہ کیا جاتا تھا۔اس دور کے مشہور خطاطوں میں میر محمود، شیخ بایزید پورانی اور میر معصوم بھکری قابل ذکر ہیں۔اس زمانے میں ملتان میں عربی رسم الخط کا رواج تھا۔ملتان میں عبید بن احمد بغدادی نے سب سے پہلے فن کتابت کو فروغ دیا۔اس کے بعد دوسرے ملکوں سے علما اور فضلا نے اس خطہ کا رخ کیا جس کی بدولت ملتان علم وادب کا گہوارہ بن گیا۔اس زمانے میں حضرت شاہ یوسف، حضرت غوث بہاءالدین زکریا ملتانی، حضرت علامہ کمال الدین ملتانی، حضرت مولانا سید جمال الدین بلخی ملتانی، حضرت ملا امام الدین مبارک، حضرت علامہ قطب الدین کاشانی، حضرت علامہ عبداللہ، حضرت شاہ حسین قادری ملتانی جیسی شخصیات نے روحانیت کے علاوہ علم وادب اور فن خوش نویسی کو فروغ دیا۔ان حضرات کے کتبات اور قلمی نسخے آج بھی بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ملتان کے علاوہ لاہور بھی اسلامی عہد کی ابتدا سے ہی علم وادب کا مرکز رہا ہے۔لاہور میں بڑے بڑے علما، فضلا اور ماہرین فن گزرے ہیں۔لاہور میں غزنوی دور میں ہی ہزارہا علمی مسودے اور قلمی نسخے تیار کیے گئے۔لاہور میں کچھ خاندان نسل درنسل اس فن کو اپنائے ہوئے تھے۔مغلیہ عہد سے قبل لاہور میں خط نسخ اور عربی کے خط رائج تھے۔مغلیہ عہد میں لاہور کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی، اور خط نستعلیق بھی یہاں پر شاہانہ طور پر رائج ہو گیا۔

ہندوستان میں دکن بھی تاریخی اور علمی اعتبار سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔بہمنی سلطنت کے قیام کے بعد سے یہ صوبہ خود مختار اسلامی سلطنت بن کر منظر عام پر آیا۔اس سلطنت کے تعلقات براہ راست ایران اور اسلامی دنیا سے تھے، جس کی وجہ سے اس دور میں دکن میں بھی خط نسخ اور نستعلیق پہنچ چکا تھا۔دکن میں عادل شاہی دور میں بھی عربی خطوط رائج العام تھے، جن میں ثلث اور نسخ کو بہت اہمیت حاصل رہی۔اس دور میں دکن میں نستعلیق خط کا رواج بھی آہستہ آہستہ پہنچ چکا تھا، اور خط نستعلیق میں تصانیف اور خطی نسخے مرتب کیے گئے۔ ہندوستان میں لکھنؤ کو بھی خطاطی اور خوش نویسی میں اہم مقام حاصل ہے۔اس علاقے میں فن خطاطی کی تاریخ نواب شجاع الدولہ سے شروع ہوتی ہے، جو اودھ کے پہلے ناظم اور وزیر تھے۔اودھ میں اس زمانے میں اس فن کے استاد منشی چندر بھان اور منشی شیخ بھان تھے۔یہ خط نستعلیق میں آقا عبدالرشید

دیلمی کے شاگرد تھے۔اس دور کے دوسرے اہم استاد محمد عطا حسین خاص مرصع تھے جو خط نسخ اور خط نستعلیق میں کمال رکھتے تھے۔اس زمانے میں فن خوش نویسی کو لکھنؤ میں بڑا عروج حاصل ہوا،اس کا یہ سبب تھا کہ حافظ نوراللہ اور قاضی نعمت اللہ لاہوری اُسی دور میں وارد لکھنؤ ہوئے۔نواب آصف الدولہ نے دونوں کی قدردانی کی۔قاضی نعمت اللہ کو خدمت اتالیقی پر مقرر کیا اور حافظ نوراللہ دفتر انشا میں افسر ہوئے۔ان دونوں نے فن خطاطی میں کثرت مشق سے وہ ترقی کی کہ لوگ اساتذۂ سلف کو بھول گئے۔حافظ نوراللہ کی وصلیاں ان کی حیات میں ایک ایک اشرفی میں فروخت ہوتی تھیں۔حافظ صاحب کے ایک شاگرد میر علی ملیح آبادی نواب محمد سعید خان کی خواہش پر رامپور آ گئے اور نواب یوسف علی خاں کے اتالیق مقرر ہوئے۔میر علی کی بدولت رامپور کے ہر گھرانہ میں فن خوش نویسی کا ذوق پیدا ہو گیا۔

فن خطاطی میں ہندوستانی تاریخ کے گم شدہ اوراق، ہندوستان کی عظمت رفتہ کی داستانیں،قوم و ملک کے تذکرے چھپے ہوئے ہیں۔المختصر یہ کہ مغلیہ دور کی خطاطی آج بھی ہم اس دور کی عمارتوں مثلاً تاج محل، جامع مسجد دہلی کے علاوہ عجائب گھروں میں رکھے مخطوطات،اور دیگر ساز و سامان کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ان تمام چشم دید خطاطیوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہمیں سرزمین ہند میں عہد گزشتہ کی تمام تر میراث سے اس عہد کی عظمت رفتہ کا بہترین اندازہ ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

کتابیات:

۱۔تذکرۂ خوش نویسان حیدرآباد،محمد ضمیرالدین،اردو اکیڈمی آندھرا پردیش،حیدرآباد،سنہ ندارد

۲۔تذکرۂ خوش نویسان کشمیر، پروفیسر مولوی محمد ابراہیم صدیقی،سرینگر،۱۹۹۷ء

۳۔تذکرۂ خوش نویسان، پروفیسر محمد عبداللہ فائز، جے پور، ۱۹۹۴ء

۴۔مرقع خوش نویسان (مختصر تذکرۂ خطاطان ہند و ایران)،سید احمد رامپوری،نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

۵۔آب کوثر، شیخ محمد اکرام، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، پاکستان، ۱۹۸۴ء

۶۔عہد وسطیٰ کا ہندوستان، پروفیسر ستیش چندر،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی، ۲۰۰۳ء

۷۔اعجاز خطاطی،خورشید عالم گوہر قلم،لاہور، پاکستان، ۲۰۱۴ء

☆☆☆

ڈاکٹر فیضان حیدر
شعبۂ اردو و فارسی، سی۔ ایم کالج، دربھنگہ، رابطہ نمبر:7388886628

محسن رضا رضوی ؔ فن ہمارا' کی روشنی میں

تلخیص:

ڈاکٹر محسن رضا رضوی ایک کہنہ مشق ادیب، نقاد اور شاعر ہیں، جنھوں نے اردو ادب میں اپنی علمی و فکری بصیرت سے نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ ان کی تحریریں تنقیدی شعور اور گہرے مطالعے کی آئینہ دار ہیں۔ وہ شاعری، تحقیق اور تنقید کے میدان میں یکساں مہارت رکھتے ہیں اور ان کی علمی کاوشیں اردو ادب کے قارئین کے لیے فکری رہنمائی کا باعث ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ 'فن ہمارا' ان کی فنی پختگی اور فکری گہرائی کا بین ثبوت ہے۔ اس مجموعے میں شامل غزلیں ان کی حساس طبیعت، جمالیاتی ذوق اور کلاسیکی و جدید اسالیب کے امتزاج کی عکاس ہیں۔ ان کی شاعری میں زبان کی شائستگی، بیان کی سادگی اور خیالات کی بلندی نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں داخلی کیفیات، عصری مسائل اور فکری بالیدگی کو نہایت خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ ان کے اشعار میں نہ صرف شعری لطافت موجود ہے بلکہ فکری وسعت بھی نظر آتی ہے، جو قارئین کو فکری سفر کی سیر کراتی ہے۔ ڈاکٹر محسن رضا رضوی کی شاعری روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہے، جس میں فنی مہارت، تہذیبی شعور اور فکری وسعت نمایاں ہے۔ 'فن ہمارا' ان کی فنی بصیرت اور فکری تنوع کا خوب صورت مظہر ہے، جو اردو شاعری سے شغف رکھنے والوں کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

کلیدی الفاظ:

محسن رضا رضوی، فن ہمارا، ادیب، نقاد، شاعر، تہذیبی شعور، فکری تنوع۔

....

محسن رضا رضوی ؔ دبستان عظیم آباد کے ان محققین و ناقدین میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی علمی و ادبی تابانیوں سے افقِ دبستان عظیم آباد روشن و منور ہے۔ ان کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی سرگرمیوں کا اعتراف

بڑے بڑے محققین و ناقدین نے کیا ہے۔ ان کی کئی کتابیں علمی و ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی گئیں۔ ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں صرف تحقیق و تنقید تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ 'عکسِ اشک' ان کے نوحوں کا مجموعہ ۱۹۸۶ء میں ہی اکیس سال کی عمر میں منظر عام پر آ کر مقبولیت کی سند حاصل کر چکا ہے۔

ان کا شمار شفیع مسلم ہائی اسکول (دربھنگہ) کے ان لائق و فائق فرزندوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی علمی، ادبی، تحقیقی اور تخلیقی سرگرمیوں سے کم عمری میں ہی علمی و ادبی حلقے میں اپنی شناخت مستحکم کر لی۔ انھوں نے ۱۹۸۲ء میں شفیع مسلم ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۸۴ء میں ملت کالج دربھنگہ سے آئی اے اور ۱۹۸۸ء میں سی۔ ایم کالج دربھنگہ سے بی اے (اردو) کی سند حاصل کی۔ مزید تعلیم کی غرض سے ملک کی مشہور و معروف درس گاہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ۱۹۹۳ء میں اردو میں ایم اے کیا۔ ۱۹۹۳ء کے وسط سے دسمبر ۱۹۹۳ء تک بہار لسانی و اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کے پرائیویٹ سکریٹری رہے۔ جنوری ۱۹۹۴ء سے جون ۲۰۰۲ء تک بہار قانون ساز کونسل کے چیئرمین کے پرائیویٹ سکریٹری رہے۔ ۱۹۹۹ء میں پروفیسر علیم اللہ حالی کی نگرانی میں ''مجتبیٰ رضوی اور ہم عصر شعری رجحانات'' کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یکم جولائی ۲۰۰۲ء کو اورینٹل کالج پٹنہ سٹی میں استاد مقرر ہوئے۔ پھر صدر شعبہ ہو گئے اور تا حال اسی عہدے پر فائز ہیں۔

'فن ہمارا (مجموعہ غزلیات)' ان کے شعری سلسلے کی دوسری سعیِ جمیل ہے جو آج سے تقریباً پینتیس سال قبل ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سے اب تک وہ بڑی تندہی سے تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں میں مصروف و منہمک ہیں۔ امید ہے کہ عنقریب وہ اپنے نئے شعری مجموعے کے ساتھ آسمان علم و ادب پر مثلِ آفتاب روشن و منور ہوں۔ انھوں نے زیر نظر شعری مجموعے کا نام میر تقی میرؔ کے اس شعر سے اخذ کیا ہے ؎

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا   سو ٹھہرا ہے وہی اب 'فن ہمارا'

کتاب کے آغاز میں دو اہم ناقدین کی تقریظیں شامل ہیں۔ پروفیسر اویس احمد دوراںؔ 'مجھے کچھ کہنا ہے' کے ذیل میں ان کے فکر و فن پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''...... مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آج کے تازہ دم اور جواں سال شاعر محسن رضا رضویؔ جو نئے وعدوں کے ساتھ افق شاعری پر طلوع ہوئے ہیں صرف داخلیت کے شاعر نہیں ہیں۔ بلکہ اس سماج کے بھی شاعر ہیں جو ان کے ارد گرد پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے صرف اپنے ذاتی

غم کو اپنا محور فکر نہیں بنایا ہے بلکہ سماج کے ان مسائل کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے جو ہماری موجودہ زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔''[۱]

اسی طرح ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر علیم اللہ حالیؔ تحریر کرتے ہیں:

''انھوں نے شاعری کو فیشن یا فارمولے کی طرح نہیں اپنایا ہے۔ اسے کسی آئین و دستور کی وکالت کا بہانہ بھی نہیں بنایا ہے۔ الفاظ و تراکیب کے ساختہ حسن سے مرعوب کرنے کی کوشش بھی نہیں کی ہے۔ بخلاف اس کے وہ شعری اظہار میں اپنے دل کی بیتی بیان کرتے ہیں۔ ان کے دل پر جو گزرتی ہے وہ اسے رقم کرتے ہیں۔ مسائل جس طرح انھیں متاثر کرتے ہیں اور جس طریق اظہار سے باہر آتے ہیں وہ انھیں بڑی دیانت داری کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں......وہ شاعری کرتے نہیں شاعری ان سے ہوجاتی ہے۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ وہ جبلی اور خلقی اعتبار سے روح سخن سے قریب ہیں۔''[۲]

محسن رضا رضویؔ نے خود بارگاہ خداوندی میں یہ دعا بھی کی ہے کہ ؎

تمام جن و بشر پہ تیرے ہو رحمتوں کا نزول یارب
یہ کہکشاں چاند یہ ستارے ہوں میرے قدموں کی دھول یارب

اوران کی دعا بارگاہِ ایزدی میں مقبول بھی ہوئی۔ چنانچہ ان کی شاعری میں حسن و لطافت کے ساتھ زور اور اثر انگیزی بھی پیدا ہوگئی۔

عشقیہ شاعری دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ ایک وہ جو خالص روایتی ہے اور دوسرے وہ جس کا پس منظر تو روایتی ہے لیکن اس میں اسلوب کی ندرت اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ جب رضویؔ کے اشعار کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی عشقیہ شاعری بھی روایتی ہے لیکن اس میں روایتی جکڑ بندیوں سے انحراف اور ایک جدت کا احساس ہوتا ہے۔ ذیل کے چند اشعار دیکھیے ؎

سارا اشارہ، سارا کنایہ اس چہرے کے نام حرف و بیاں کا سارا سودا اس چہرے کے نام
میرے چہرے کے حصے میں راہِ سفر کی دھوپ ساری ٹھنڈک سارا سایہ اس چہرے کے نام
تشنہ لبی کی ساری سوزش میرے ہونٹ کا نقش میرے لہو کا سارا دریا اس چہرے کے نام
اپنی غزل کا اک اک مصرع رضویؔ اس کی نذر یہ مہنگا ترسیل کا سودا اس چہرے کے نام

بادی النظر میں ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف قدامت پسند غزل گویوں کی کامیاب پیروی کی کوشش کی ہے۔ وہی لفظیات، ترکیبات اور الفاظ کی در و بست، اس کے باوجود انھوں

نے دردِ نہانی کے اظہار میں فن کارانہ مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر محبوب کے تجاہل و تغافل، ظلم وستم اور جور و جفا کے ساتھ اس کے ہرجائی پن نے ان کے دل کی آگ کو مزید بھڑکا دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اپنی حقیقی زندگی میں ذاتی طور پر عشق ومحبت سے گزرے ہیں یا نہیں۔ لیکن انھوں نے جو عشقیہ واردات و کیفیات پیش کی ہیں وہ بالکل حقیقت سے قریب ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان مراحل سے اپنی ذاتی زندگی میں گزرے ہیں۔ وہ عشق ومحبت میں گزرنے والی تمام واردات و کیفیات سے بخوبی واقف ہیں اور ان کو اسی جوش اور جذبے کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس طرح وہ ایک دل دار عاشق کے ذہن ودماغ میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے۔

مجھ کو اس گل رخ کی ساری برہمی اچھی لگے سردمہری، سرکشی، بے گانگی اچھی لگے
مجھ کو بھی تیری وہ زیر لب ہنسی اچھی لگے جس پہ مفتوں ہے زمانہ جس پہ قرباں ہے نظر

یہ اشعار نفیس اور نازک جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں، جہاں شاعر محبوب کی بے اعتنائی، ناز وادا، اور شوخ تبسم کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ شاعر نے روایتی عاشقانہ جذبے کو ایک منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ عام طور پر محبوب کی بے رخی شکوہ بن جاتی ہے، مگر یہاں شاعر اس کی بے اعتنائی کو بھی سراہے جانے کے قابل سمجھتا ہے۔ یہ اشعار نازک خیالی کا بھی عمدہ نمونہ ہیں، جہاں محبوب کی سردمہری، سرکشی اور بے گانگی جیسی کیفیات بھی دل کو بھلی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ انداز کلاسیکی اردو شاعری میں میرؔ و غالبؔ کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ سردمہری، سرکشی، بے گانگی، برہمی، مفتوں اور قرباں جیسے الفاظ نہ صرف مضمون کو تقویت دیتے ہیں بلکہ اشعار میں موسیقیت اور روانی بھی پیدا کرتے ہیں۔ محبوب کی نزاکت وحسن کا منفرد اظہار محبوب کے حسن کا ذکر عمومی انداز میں نہیں کیا گیا بلکہ اس کی برہمی اور زیرلب ہنسی کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے، جو عشق کی لطیف کیفیتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شاعر نے مختصر الفاظ میں محبوب کی مختلف کیفیتوں کو نہایت خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔

حسنِ تضاد (Antithesis) سردمہری اور برہمی جیسی کیفیات کے ساتھ زیرلب ہنسی کا ذکر ایک لطیف تضاد پیدا کرتا ہے، جو شعر کی تاثیر کو بڑھاتا ہے۔ یہ اشعار کلاسیکی اردو شاعری کی نازک خیالی، حسنِ اظہار اور محبوب کی نزاکت کے جدید انداز میں بیان کا خوب صورت امتزاج ہیں۔ عاشق کا محبوب کی ہر ادا کو پسند کرنا، حتیٰ کہ اس کی بے رخی اور غصہ بھی محبوب معلوم ہونا، ایک دل کش شعری تصور ہے جو اردو غزل کی لطیف روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

ان کی عشقیہ شاعری میں جنسی میلانات واحساسات کا گزر نہیں اور نہ ہی ان کی شاعری میں جنسی

ناہمواریاں، ابتذال اور سوقیت پائی جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عورت و مرد میں انسانی یا جنسی محبت کا جذبہ اردو غزل میں نیا نہیں ہے۔ قدیم شعرا نے اپنے معشوق کے سراپا کے بیان میں اس کے خد و خال، لب و رخسار، زلف و گیسو، دہن و کمر، چھاتی اور جوبن وغیرہ کا تذکرہ بڑی آب و تاب کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن رضوی کی شاعری میں یہ جذبات و احساسات، معاملات و تجربات کی حدود سے آگے نکل گئے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی شاعری آپ بیتی نہ رہ کر جگ بیتی ہوگئی ہے۔ اس کے مطالعے کے وقت قاری کو احساس ہوتا ہے کہ یہ خود اس کے دل کا درد ہے جسے شاعر کی زبانی پڑھ رہا ہے۔ یہی وہ شے ہے جس سے ان کی شاعری کا تقدس باقی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مظہر امام نے کہا ہے:

''شاعری اپنے منصب سے گر جاتی ہے، اگر اسے شہرت اندوزی کا وسیلہ بنایا جائے یا اسے جاہ و حشمت کے حصول کے لیے نردبان کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہ ایک ایسا نازک آبگینہ ہے جو مادی طمع کی ہلکی سی ٹھیس کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ محسن رضا رضوی اس آبگینے کے تقدس اور حرمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آج کے دور میں شعر گوئی ایک کارِ زیاں ہے، وہ اسے حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ یہ کاروبارِ شوق ان کی باطنی آسودگی کا ذریعہ ہے۔ وہ عمر کی جس منزل میں ہیں وہاں ''سارا سودا اس چہرے کے نام'' کرنا ہی دلیل سرخروئی ہے۔''[۳]

یقیناً مظہر امام کا کہنا بجا ہے کہ جب شاعری اپنے منصب سے گر جاتی ہے اور شہرت اندوزی کا وسیلہ بن جاتی ہے تو اس کی شعریت جاتی رہتی ہے۔ محسن رضا رضوی اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔ انھیں شعر کی لطافت اور اس آبگینے کی نازکی کا پورا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری کو اس کے منصب سے نیچے نہیں آنے دیتے۔ ان کی فصاحت التزام اور بلاغت انضمام غزلوں کی دلآویزی اور حسن کاری مطالعے کے وقت دل و دماغ پر کیف سا سماں باندھ دیتی ہے جس سے ذہنی تمرکز برقرار رہتا ہے۔ دل کی زبان کا اثر کچھ اہلِ دل ہی جانتے ہیں۔ ان کی خوش گوئی، مضمون آفرینی اور نکتہ سنجی پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ مضامین سرود بے ہنگام سے ان کے دلی جذبے کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ یہ چند اشعار دیکھیے ؎

عرفان کارواں کو کہاں ان اداؤں کا
بیٹھا ہوں اور ہاتھ میں کانٹا ہے پاؤں کا

ہم بھی چلیں اسی سے سہارا طلب کریں
سنتے ہیں آسرا ہے وہ بے آسراؤں کا

صحرا بھی مجھ کو کوچۂ جاناں سے کم نہیں
جو دل کا داغ تھا وہی چھالا ہے پاؤں کا

کچھ وہ بھی بے وفائی سے آنے لگے ہیں باز
کچھ ہم بھی راز جان گئے ہیں جفاؤں کا

ہاتھوں میں اب ہیں چاک گریباں کی دھجیاں دامن نے راز کھول دیا ہے قباؤں کا

ان کو ہر رنگ میں شاعری پر قدرت حاصل ہے۔ان کی غزلوں میں قدامت، جدت، ندرت، نکتہ سنجی غرض ہر رنگ دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ان کا ہر شعر صفائی خیال کا ایک ضوفشاں آئینہ ہے اور قوت تخیل عام فضائے شاعری سے کہیں زیادہ بلندی میں مشق پرواز کا حوصلہ رکھتی ہے۔زبان و بیان پر بھی خاص ملکہ حاصل ہے۔زبان کی صفائی اور نوک پلک درست کرنے میں وہ بڑی محنت صرف کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں لسانی ناہمواری بہت کم پائی جاتی۔ان کی جمالیاتی حس نے ان کی شاعری میں جو رنگ ونور کی محفلیں سجائی ہیں اس سے ان کی زبان نکھرتی گئی۔وہ رنگینی کے بجائے سادگی پر جان چھڑکتے ہیں۔ چنانچہ ایسے الفاظ وتراکیب کا انتخاب کرتے ہیں جن سے ان کی غزلوں میں سادگی اور حسن کے ساتھ تاثیر میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

یہ فن تو مرے گھر کا رفیق ازلی ہے یہ شاعری اجداد کی گودوں کی کھلائی

تھمتا ہی نہیں سلسلۂ قافلۂ شوق جنگل ہو کہ صحرا کہ سمندر کی ترائی

ہر رگ میں مچلتے ہوئے سورج کے ہیں ذرّات میں نے کبھی سائے کی رفاقت بھی نہ پائی

چوں کہ ان کے گھرانے میں کئی پشتوں سے علم وحکمت کا چراغ روشن ہے اور شعروشاعری کے چرچے رہے ہیں، خصوصاً ایام عزا میں مرثیوں، سلاموں اور نوحوں کی آوازیں گونجتی رہی ہیں، اس لیے انھوں نے شاعری کو اپنا رفیق ازلی ٹھہرایا اور ان کے آبا واجداد نے اس فن کے نوک پلک درست کیے ہیں اس لیے اس کا تذکرہ فخر ومباہات سے کیا ہے۔لیکن ان کا جذبۂ شوق یہیں ٹھہرتا نہیں بلکہ وہ اس فن کو نئی جلا بخشنے کے لیے اس کے نہال کو اپنے خون جگر سے سینچتے ہیں۔اس راہ پرخطر کی ساری مشکلیں اور مشقتیں جھیلنے کو تیار ہیں۔وہ اپنے محبوب سے اس کی سردمہری، عہد شکنی، جور وجفا اور ظلم وستم کا بیان اس انداز میں نہیں کرتے جیسے اردو کے اکثر شعرا کرتے ہیں بلکہ وہ انھیں اپنے عشق کا درماں بنالیتے ہیں۔ان کی غزلوں کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ وصل کے نہیں، ہجر کے شاعر ہیں اور خلوت میں عشق کی تپش سے خود کو کندن بنانے کے خوگر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں شعری حسن، سوز وگداز، فنی واقعیت اور صداقت اپنے کمال پر نظر آتی ہے۔

اس کی بزم ناز تھی حشر آفریں میں چھپاکر اپنی خلوت لے گیا

آدمی کو خود فریبی کا جنوں دے گیا خواب اور حقیقت لے گیا

یہ اشعار انسانی نفسیات، خودفریبی اور حقیقت کے فریب کارانہ اثرات کو نہایت لطیف اور گہرے

پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ شاعر نے الفاظ کی خوش تراشی اور معانی کی تہ داری کے ذریعے ایک ایسا منظر نامہ تخلیق کیا ہے جہاں حقیقت اور خواب کی کشمکش نمایاں ہے۔ پہلے شعر میں بزم ناز یعنی محبوب کی محفل کو حشر آفریں قرار دیا ہے، جو اس کی ہیبت اور تاثیر کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ محفل ایسی ہے جہاں جذبات کی شدت قیامت کا سماں باندھ دیتی ہے، لیکن شاعر خود کو اس ہنگام سے علیحدہ کر لیتا ہے اور ''اپنی خلوت لے گیا'' یعنی وہ گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے۔ اس عمل میں ایک داخلی تضاد ہے۔ ظاہراً وہ محفلِ حسن وعشق سے خود کو دور کر لیتا ہے، لیکن درحقیقت وہ اس محفل کے اثرات سے بچ نہیں پاتا۔ دوسرا شعر انسانی فطرت کی ایک نہایت گہری حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ ''آدمی کو خود فریبی کا جنوں'' ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کی نشان دہی کرتا ہے جہاں انسان حقیقت سے آنکھ چرانے اور خود ساختہ سرابوں میں کھو جانے کا عادی ہو جاتا ہے۔ لیکن اس خود فریبی کی قیمت کیا ہے؟

''دے گیا خواب اور حقیقت لے گیا'' یہ مصرع ایک دردناک سچائی کی طرف اشارہ ہے کہ انسان خوابوں کی دنیا میں کھو کر اپنی حقیقت گنوا بیٹھتا ہے، اور جب حقیقت کا سامنا ہوتا ہے تو خوابوں کا فریب چھنٹ جاتا ہے، مگر اس وقت تک زندگی کی حقیقتیں اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہوتی ہیں۔ یہ اشعار حسنِ کلام، بلندئ تخیل اور انسانی نفسیات کی عکاسی کے حوالے سے غیر معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں نہ صرف ایک لمحہ فکریہ پوشیدہ ہے بلکہ ایک دردمندانہ طنز بھی موجود ہے، جو قاری کو غور و فکر پر مجبور کرتا ہے۔

ان کی غزلیہ شاعری میں حسن وعشق یا طریقۂ عشق کا ایک منفرد انداز نظر آتا ہے، انھوں نے غزل کو جمالیاتی جہت بخشی۔ لیکن ان کو اس بات کا احساس ہے کہ ''من آنم کہ من دانم۔'' وہ درد کو درد نہیں درماں سمجھتے ہیں اور راہِ عشق میں کسی مقام و منزل کو اپنا ہدفِ آخر نہیں سمجھتے۔ وہ عشق کو مختار قرار دیتے ہیں نہ کہ مجبورِ محض۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

جسے سب درد کہتے ہیں اسے ہم دل سمجھتے ہیں
وہ کوئی اور ہیں جو راہ کو منزل سمجھتے ہیں

صرف رکھنا تھا اسے حسن کی شوخی کا بھرم
عشق ہر حال میں مختار تھا مجبور نہ تھا

ان کی شاعری میں عشق و عرفان اور متصوفانہ مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ذات باری تعالیٰ نے جب اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہا تو ایک خاص مخلوق کو پیدا کیا جس کے صدقے میں کائنات عالم ظہور میں آئی۔ اس طرح وحدت نے اپنے جلووں کو کثرت کی صورت میں ظاہر کیا۔ کیوں کہ وحدت ذات باری تعالیٰ کی اور کثرت کائنات کی صفت ہے۔ لیکن اس ذات باری تعالیٰ نے کثرت میں اپنی ذات کے مظہر دکھائے۔ اسی طرح جب پہلی مخلوق نے روئے زمین پر اپنا قدم رکھا تو اس نے اپنے

آپ کو یک وتنہا محسوس کیا، چنانچہ اللہ نے اس کا ہمسر پیدا کیا۔ پھر اس سے آدمیت کا سلسلہ چلا۔ لیکن کمتری اور برتری کے احساس نے بھائی کے ہاتھوں بھائی کو قتل کرا دیا۔ اس پس منظر میں یہ اشعار دیکھیے ؎

جو آنکھ کھولی تو پیش منظر میں ایک عالم تھا صرف ہو کا
نہ کوئی جھگڑا تھا آرزو کا، نہ کچھ جھمیلا تھا رنگ و بو کا
شفق میں، عارض میں، لب میں، گل میں، تمام سرخی بکھر گئی ہے
بنا کئی داستاں کا عنواں، جو خون ابلا رگِ گلو کا
ضمیر آدم میں برتری کا یہ کیسا ارمان پل رہا ہے
یہ خواجگی کی طلب ہے کیسی خدا ہے کیا بندگی کا بھوکا

یہ اشعار ان کے نکھرے ہوئے جمالیاتی ذوق کے ساتھ ان کے شعری احساس کا پتہ دیتے ہیں۔ ان میں تہ در تہ معانی کی وسعت، تشبیہات و استعارات اور علامتوں کا استعمال قابل تحسین ہے۔ یہاں انھوں نے استعاروں اور علامتوں کو اس انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے گویا اس کو فطری روپ دے رہے ہیں، اور یہی عمدہ شاعری کی علامت بھی ہے۔ انھوں نے اپنی عارفانہ اور صوفیانہ شاعری کے ذریعہ اردو شاعری کو فکری پہلو بھی دیا اور استغنا کا درس بھی۔ ساتھ ہی مزاجوں میں خودداری اور بے نیازی بھی پیدا کی۔

ان کی غزلیہ شاعری کا رنگ و آہنگ اوروں سے جدا ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے کے وقت ایک نئی فضا، نئی کیفیت اور نئی معنویت کا احساس ہوتا ہے۔ خودداری اور بے نیازی ان کی ذات کا عظیم جوہر ہے۔ اس سے ان کی غزلیہ شاعری کے مزاج، فضا اور محرکات پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ درج ذیل اشعار ان کے مزاج کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں ؎

کھلا تھا بابِ اجابت مچل کے لوٹ آیا		دعا کا پیک ارادہ بدل کے لوٹ آیا
ہمارے ساتھ وہ کچھ دور راہ امکاں میں		قدم ملا کے چلا اور چل کے لوٹ آیا
وہ پھول ہاتھ میں لے کر لہو لہان ہوا		میں اپنے پاؤں سے کانٹے مسل کے لوٹ آیا
حسین خواب مری آنکھ کے دریچے تک		گیا تو تھا مگر آنسو میں ڈھل کے لوٹ آیا

اس مجموعے سے ان کے چند نمائندہ اشعار جنھوں نے راقم السطور کو متاثر کیا ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

ہر اک مقام سے لوٹا ہوں بے نیازانہ		مجھے نہیں ہے سزا و جزا کا اندیشہ
غضب ہے وصل میں دونوں طرف تامل تھا		اِدھر جنوں تو اُدھر تھا حیا کا اندیشہ

حالات موافق ہوں تو دل رہتا ہے بے تاب
حملہ ہو بلاؤں کا تو ہوجاتا ہوں خرسند
محفل میں مناسب ہے کہ رضویؔ کو نہ چھیڑو
ہوتا ہے کہیں بندۂ بے باک کا منھ بند
......

نہ جانے آج وہ کیسے خزاں کی زد پہ آبیٹھا
سنایا کرتا تھا کل تک جو لالہ زار کے قصے
سنا ڈالو اسے کرب و بلا کی داستاں رضویؔ
اگر سننا کوئی چاہے یہاں ایثار کے قصے

ان کی شاعری کے مجموعی جائزے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے غزلیہ شاعری میں اپنے جذبات کے اظہار کے لیے رمزی اور ایمائی پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے جو غزل کی آبرو ہے۔ یہ پیرایۂ بیان ان کے مزاج سے بھی بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری ان کے درونی جوش وخروش کا سرچشمہ ہے جو تکلف وتصنع اور آورد سے مبرا ہے۔ چوں کہ یہ ان کی جوانی کے ایام کا مجموعہ ہے اس لیے کہیں کہیں زبان و بیان میں ناہمواری کھٹکتی ہے لیکن پورے مجموعے میں جذبے کا بے محابا اظہار، فنی رچاؤ اور شائستگی موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں سادگی، سلاست اور حسن کے ساتھ اثر انگیزی بھی موجود ہے۔ لطافت، پاکیزگی، رعنائی، معصومیت، دل کشی اور درد وتڑپ ایسے لازوال نقوش ہیں جو ان کو ہم عصروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

یہاں اس بات کا اقرار بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر محسن رضا رضوی کی شاعری محض الفاظ کی مرقع سازی نہیں بلکہ ایک فکری سفر، تہذیبی آگہی اور فنی لطافت کا حسین امتزاج ہے۔ 'فن ہمارا' میں ان کے اشعار دل کی دھڑکنوں میں نغمگی، خیالات میں وسعت اور احساسات میں گہرائی کا جادو جگاتے ہیں۔ ان کا کلام روایت کی خوشبو سے معطر اور جدت کی روشنی سے منور ہے، جو قاری کو فکری لذت، جمالیاتی انبساط اور روحانی تسکین عطا کرتا ہے۔ ان کی شاعری محض پڑھنے کی چیز نہیں، بلکہ محسوس کرنے، سمجھنے اور زندگی کے نئے زاویے تلاش کرنے کا وسیلہ ہے۔ بلاشبہ 'فن ہمارا' اردو شاعری کے دبستان میں ایک درخشاں اضافہ ہے، جو ڈاکٹر محسن رضا رضویؔ کے ادبی قد وقامت کا آئینہ دار ہے اور انھیں اردو کے سنجیدہ شعرا کی صف میں نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ فن ہمارا، محسن رضا رضویؔ، رفتار نو پبلی کیشنز، دربھنگہ، ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۔۱۱
۲۔ فن ہمارا، محسن رضا رضویؔ، ص ۱۳۔۱۴
۳۔ فن ہمارا، محسن رضا رضویؔ، پشت کی تحریر

☆☆☆

احسن امام احسنؔ
سمنت پوری، بھوبنیشور، رابطہ نمبر:9556873697

ڈاکٹر مقبول احمد مقبولؔ کی تنقید نگاری

تلخیص

مقبول احمد مقبولؔ شاعر و ادیب کے ساتھ ساتھ ناقد و محقق بھی ہیں۔ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ اور پروفیسر کے منصب پر فائز ہیں۔ پینتیس برسوں سے شعر و ادب کی دنیا میں سرگرم ہیں۔ نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن غزل اور رباعی ان کی پسندیدہ اصناف ہیں۔ مقبول احمد مقبول کی تنقید نپی تلی اور غیر جانب دار ہوا کرتی ہے۔ ان کے فکر و فن کو پرکھنے کے لیے ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی تنقید کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر مقبول احمد نے تنقید کے نام پر قاری کو لچھے دار باتوں کے سحر میں گرفتار نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے صاف ستھری اور واضح زبان اور اسلوب میں کہا ہے اور حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ کسی بات کو سلیقے سے کہنے کا ہنر وہ خوب جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ہو یا تنقید لوگوں کی توجہ اپنی طرف جلد مبذول کروالیتی ہے۔ تین شعری مجموعے اور چار تنقیدی و تحقیقی کتابیں آپ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ مقبول احمد مقبول نے جہاں معرف قلم کاروں پر مضامین قلم بند کیے ہیں وہیں غیر معروف اور علاقائی شعرا و ادبا پر بھی قلم اٹھایا ہے جو ان کی وسعتِ قلبی کا مظہر ہے۔ مقبول احمد کے تنقیدی مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت کی طرف سے ان کو زبردست ناقدانہ صلاحیت عطا ہوئی ہے۔

کلیدی الفاظ:

ناقد، محقق، شعری مجموعے، تبصرہ نگار، پیشہ تدریس، مترجم، صنائع و بدائع، محاسن، معائب، اوزان و بحور، ژولیدہ بیانی، ابہام، عروضی شعور، کلاسیکی شاعری، فنی کمزوری۔

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول دنیائے شعر و ادب کا مقبول نام ہے۔ ان کی پہلی شناخت شاعر کی حیثیت

سے ہے۔ یہ غزل اور رباعی کے معروف شاعر ہیں۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے (غزلوں کے دو مجموعے اور رباعی کا ایک مجموعہ) شائع ہو کر اربابِ علم و ادب سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ تقریباً پینتیس برسوں سے یہ دنیائے شعر و ادب سے وابستہ ہیں۔ خوش فکر شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اپنی پہچان قائم کی ہے۔ پیشۂ تدریس سے وابستہ ہیں اور فی الحال مہاراشٹر کے ایک کالج کے شعبۂ اردو میں پروفیسر کے منصب پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول تخلیقی ذہن کے مالک تو ہیں ہی، اس کے علاوہ ان میں تنقیدی صلاحیت بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ یہ شاعر کے باوصف ایک اچھے ناقد اور تبصرہ نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ انھیں جتنی قدرت نظم پر حاصل ہے اتنی ہی قدرت نثر پر بھی ہے۔ مقبول احمد مقبول کے فکر و فن کو پرکھنے کے لیے ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی تنقید کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے صاف ستھری اور واضح زبان اور اسلوب میں کہا ہے اور حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ کسی بات کو سلیقے سے کہنے کا ہنر وہ خوب جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ہو یا تنقید لوگوں کی توجہ اپنی طرف جلد مبذول کروا لیتی ہے۔

مقبول احمد کے تنقیدی مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت کی طرف سے ان کو زبردست ناقدانہ صلاحیت عطا ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ تحقیق کے مردِ میدان بھی ہیں۔ 'مضطر مجاز: شخصیت اور فن' ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے نوازا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۶ء میں شائع ہو چکی ہے۔ تحقیق و تنقید کے حسنِ امتزاج کی حامل اس کتاب کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس کتاب میں مقبول احمد نے جدید لہجے کے ممتاز شاعر، مترجمِ کلام اقبالِ فارسی مضطر مجاز (حیدرآباد) کی شاعری اور ان کے فن کا متوازن اور بہترین تجزیہ کیا ہے۔ پی ایچ۔ ڈی کے مقالوں میں ایسا تجزیہ خال خال ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مقبول احمد خود شاعر ہیں اور فنِ شاعری، عروض و بلاغت، صنائع و بدائع اور محاسن و معائب پر ان کی گہری نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعر و فن کے تجزیے میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔

یہ کتاب آٹھ ابواب اور ۲۷۳ رصفحات پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مضطر مجاز کے حالاتِ زندگی تحریر کیے گئے ہیں۔ دوسرا باب مضطر مجاز کی شخصیت کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر مقبول نے شخصیت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مغرب کے مشہور دانشوروں، مفکروں اور ماہرینِ نفسیات مثلاً کریچن وولف، لے بینز، لوک، ویکرٹ، فرائڈ، یونگ، ایڈلر، جرسلڈ اور میڈونالڈ کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ شخصیت کیا ہے؟ پر گفتگو کرنے کے بعد ڈاکٹر مقبول نے کسی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں کارفرما ہونے والے عوامل سے بحث کی ہے اور

آخر میں ان عوامل کی نشاندہی کی ہے جو مضطر مجاز کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما رہے ہیں۔شخصیت کی تعریف، تفہیم اور تجزیے کے حوالے سے کتاب کا یہ حصہ ڈاکٹر مقبول احمد کے وسیع مطالعے کا شاہد ہے۔

چوتھا باب مضطر مجاز کی شاعری کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔ یہ باب ڈاکٹر مقبول احمد کی تنقیدی بصیرت، اردو کے قدیم وجدید شعری سرمائے سے گہری واقفیت، عروض وبلاغت پر مہارت، صنائع بدائع اور محاسن ومعائب پر ان کی گہری نظر کی عکاسی کرتا ہے۔یہی نہیں بلکہ اس باب کے مطالعے سے ان کی تجزیاتی صلاحیت کا بھی خوب خوب اندازہ ہوتا ہے۔مضطر مجاز کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے مقبول احمد ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مضطر مجاز کی شاعری کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں جدیدیت کے ساتھ روایت کی پاسداری بھی نظر آتی ہے۔انھوں نے نہ روایت سے یکسر روگردانی کی اور نہ ہی وہ روایت پرستی کا شکار ہوئے۔ان کی شاعری روایت اور جدیدیت کا حسین سنگم ہے۔مضطر مجاز نے اردو اور فارسی کی کلاسیکی روایات سے خاطر خواہ استفادہ کرتے ہوے اپنے لیے ایک نیا راستہ نکال لیا ہے۔ وہ جدیدیے بننے کے 'شوقِ فضول' میں بے راہ روی کا شکار نہیں ہوئے۔مضطر مجاز کے یہاں ژولیدہ بیانی، ابہام، یاسیت وافسردگی، کشاکشِ حیات سے فرار کا رجحان اور اپنی ذات کے نہاں خانے میں محصور ہونے کی کیفیت نظر نہیں آتی جو نہایت خوش آئند بات ہے۔مضطر مجاز کی شاعری صحت مند عناصر سے مملو ہے۔ورنہ جدید شاعری پر ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جس میں ژولیدہ بیانی، ابہام، افسردگی اور زبان وفن کے زریں اصولوں سے انحراف وبغاوت جدید شاعری کا لازمہ سمجھا جاتا تھا۔''(ص ۸۵)

کتاب کا پانچواں باب مضطر مجاز کے کلام کے عروضی مطالعے کے لیے مختص ہے۔ یہ باب اس بات کا وافر ثبوت فراہم کرتا ہے کہ مقبول احمد کو علمِ عروض کا بھی اچھا خاصا گیان ہے۔اس باب میں مقبول احمد نے مضطر مجاز کے سارے مطبوعہ کلام کا عروضی تجزیہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ انھوں نے کتنی بحور استعمال کی ہیں اور یہ کہ ان کا غالب رجحان کن اوزان وبحور کی طرف ہے۔اگر کہیں کوئی عروضی خامی نظر آئی تو اس کی نشان دہی بھی کی ہے۔اک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''مضطر مجاز نے علمِ عروض باقاعدہ طور پر حاصل نہیں کیا، لیکن اس کے باوجود ان کا کلام بیشتر عروضی خامیوں سے پاک ہے جس سے ان کے عروضی شعور وبصیرت کا اظہار ہوتا ہے تاہم ایک دو جگہ انھوں 'ع' کو 'الفِ وصل' کی طرح استعمال کیا ہے جو بہر حال ایک عروضی خامی

سمجھی جائے گی......ایک اور مصرعے میں 'ہیں' کی ہائے ہوز گلاب کی 'ب' میں مل گئی ہے......مضطر مجاز کے بعض مصرعوں میں شکستِ ناروا کا عیب نظر آتا ہے۔''(ص ۲۰۳)

مضطر مجاز نے اقبال کے تقریباً تمام فارسی کلام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔کتاب کا چھٹا باب مضطر مجاز کی ترجمہ نگاری کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔اس باب میں بھی مقبول احمد صاحب کی تجزیاتی وتنقیدی صلاحیت کا بھر پور اظہار ہوتا ہے۔اس میں موصوف نے اقبال کے دیگر مترجمین کے تراجم سے مضطر مجاز کے تراجم کا موازنہ ومقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس کا ترجمہ کلامِ اقبال کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔یہاں مقبول احمد نے یہ بتایا ہے کہ بیشتر تراجم میں مضطر مجاز کا ترجمہ اقبال کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔

کتاب کے ساتویں باب میں مضطر مجاز کی نثر نگاری کا جائزہ لیا ہے، جب کہ آٹھویں باب میں مضطر مجاز کی ادبی صحافت پر گفتگو کی گئی ہے۔یہ دونوں ابواب بھی متوازن ہیں۔کہیں افراط وتفریط نظر نہیں آتی۔عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ پی ایچ۔ڈی کے مقالے لفاظی، جانب داری اور تعریفی وتوصیفی عبارت سے معمور ہوا کرتے ہیں۔تنقید وتجزیے کے نام پر صرف تعریف وتوصیف ہی ہوا کرتی ہے لیکن یہ مقالہ نہ صرف ان سارے عیبوں سے پاک ہے بلکہ تنقید وتجزیے کا حق ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس کتاب کے علاوہ مقبول احمد مقبول کے تنقیدی مضامین کے تین مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں جن کے نام ہیں: 'نقد ونظر، سخن شناسی اور محاکمہ۔یہ تینوں کتابیں بھی موصوف کی ژرف نگاہی اور بہترین تنقیدی صلاحیتوں کی غمازی کرتی ہیں۔مقبول احمد کی تنقید غیر جانب دارانہ اور معقول ہوتی ہے۔یہ اپنی بات پورے وثوق اور دلائل سے کہتے ہیں۔کسی کتاب کا تنقیدی جائزہ ہو یا کسی ادیب وشاعر کے فن کا تجزیہ۔ہر دو جگہ مقبول احمد گہرے مطالعے کے بعد اپنے نتائج پیش کرتے ہیں۔یہ جو بھی بات کرتے ہیں نپی تلی کرتے ہیں۔تخلیقات کے حسن وقبح کا جائزہ بڑے احسن طریقے سے لیتے ہیں۔فن پارے کی تحسین وتفہیم کا انھیں ملکہ حاصل ہے۔مقبول احمد کسی تخلیق کا فکر وخیال کے اعتبار ہی سے جائزہ نہیں لیتے بلکہ زبان وبیان اور عروض وبلاغت کے لحاظ سے بھی اس پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ان کی نظر محاسنِ کلام کے ساتھ ساتھ معائبِ کلام پر بھی رہتی ہے۔جہاں یہ محاسن کا ذکر کرتے ہیں وہیں معائب کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔دراصل یہی تو تنقید کا حقیقی منصب ہے۔

'نقد ونظر' میں شامل تمام مضامین مقبول احمد کے گہرے مطالعے اور تجزیاتی وتنقیدی صلاحیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ان میں 'کلامِ اقبال میں عصری حسیت'، 'پریم چند کی مذہبی رواداری اور انسان دوستی'، 'حالی کی فکر ونظر کا جائزہ: رباعیات کے حوالے سے'، 'اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر'، 'اردو نظم کے ارتقا

میں انجمن پنجاب کا حصہ‘،’اردو کے چار شخصی مرثیے: ایک تنقیدی جائزہ‘، ’مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری‘، ’دکن کا ایک صوفی شاعر: عطا کلیانوی‘ چند ایسے خاص مضامین ہیں جن میں ڈاکٹر مقبول کی تنقیدی وتجزیاتی قوت پورے شباب پر نظر آتی ہے۔’کلامِ اقبال میں عصری حسیت‘ اس اعتبار سے اہم اور لائقِ تحسین مضمون ہے کہ اس میں ڈاکٹر مقبول نے اقبال کے کلام کو ان کے اپنے زمانے کے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔مختلف نظموں کے اشعار پیش کر کے یہ بتایا ہے کہ اقبال کا کلام ان کے عہد کے قومی اور بین الاقوامی سیاسی وسماجی حالات کی بھر پور آئینہ داری کرتا ہے۔اس مضمون کا آخری پیراگراف ملاحظہ کریں:

’’اقبال شاعر کے ساتھ ساتھ دانشور، مفکر اور فلسفی بھی تھے۔اس لیے یہ ناممکن تھا کہ ان کا دانشورانہ ذہن اپنے عصری حالات کے ادراک وتفہیم اور تحلیل وتجزیے کی کوشش نہ کرتا اور ان کی دوررس نگاہ اپنے عہد کے نشیب وفراز کا تنقیدی جائزہ نہ لیتی۔اقبال کی حساس طبیعت اپنے عہد سے متاثر بھی ہوئی اور انھوں نے اپنی فکر ونظر سے اسے متاثر بھی کیا۔غرض اقبال کا کلام ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں اس عہد کے تمام واقعات، حادثات، تغیرات، انقلابات اور نظریات اپنے پورے خدوخال کے ساتھ نظر آتے ہیں۔‘‘(نقد ونظر،ص ۲۱)

مضمون ’اردو کے چار شخصی مرثیے‘ میں غالب کی وفات پر حالی کے تحریر کردہ مرثیے کی تحسین اس انداز میں کی ہے:

’’سچے جذبات کی پُر اثر ترجمانی، تاثیر بیانی، تسلسل اور روانی، اہلِ کمال کی قدر دانی، رقت آمیز اسلوب، برمحل الفاظ کا استعمال، غلو سے اجتناب، عقیدت ومحبت کا بے ساختہ اظہار اور مترنم بحر کی خوش آہنگی، غرض ان کئی خوبیوں سے متصف یہ مرثیہ نہ صرف شخصی مرثیوں میں ممتاز اہمیت کا حامل ہے بلکہ ایک شاگرد کا اپنے استاد کو زبردست خراجِ تحسین بھی ہے۔اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اسی مرثیے سے اردو میں شخصی مرثیے کی روایت کو استحکام حاصل ہوا۔‘‘(نقد ونظر،ص ۶۹)

’نقد ونظر‘ کے مضامین پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر قاضی عبیدالرحمان ہاشمی رقم طراز ہیں:

’’ڈاکٹر مقبول احمد مقبول کے تنقیدی مضامین پر مشتمل موجودہ کتاب ’نقد ونظر‘ کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں شامل ڈیڑھ درجن سے زائد مضامین میں شاید ہی کوئی ایسا مضمون ہو جس کو ڈاکٹر مقبول نے گہرے غور وفکر، انہماک اور خلوص سے تحریر نہ کیا ہو...... یہ مضامین ڈاکٹر مقبول کی ذہانت، طباعی، تاریخ وتہذیب، مذہب اور روحانیت کے سرچشموں سے گہری

واقفیت کی نمایاں مثالیں ہیں، مزید برآں ان کو زبان اور بیان پر جتنی اور جیسی قدرت ہے وہ آج خال خال ہی دیکھنے میں نظر آتی ہے۔''

'سخن شناسی' ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جس کے تمام مضامین عصر حاضر کے شعرا کے فکر وفن پر قلم بند کیے گئے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مقبول احمد مقبول نے ہندوستان کے ہر علاقے کے شاعر پر مضمون تحریر کیا ہے۔ان میں بعض بے حد معروف ہیں اور بعض کم۔کم معروف شعرا یا علاقائی شعرا پر قلم بند کیے گئے مضامین ڈاکٹر مقبول احمد کی وسعتِ قلبی کا مظہر ہیں۔کم معروف اور علاقائی شعرا پر لکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا معروف قلم کاروں پر لکھنا۔کتاب کے مرتب محمد عظمت الحق (جو مقبول احمد کے فرزند ہیں) نے بہت صحیح لکھا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''عام طور پر نقاد حضرات کی نظر التفات نامی گرامی قلم کاروں پر ہی مرکوز رہتی ہے۔علاقائی شعرا پر لکھنے کو وہ شاید کسرِ شان سمجھتے ہیں۔یہ منفی رجحان کوتاہ ذہنی کی ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے علاقائی شعرا کی حق تلفی بھی ہے۔ملک گیر اور مشہور و معروف شعرا کی تحسین و قدر شناسی کی طرح علاقائی شعرا کی شعری خدمات و کمالات کا اعتراف بھی نقادوں پر لازمی ہے......اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ قدر شناسی کے معاملے میں کسی قسم کے تحفظاتِ ذہنی کا شکار نہیں۔''(سخن شناسی، ص ۱۱ تا ۱۲)

کتاب کے پہلے مضمون 'کلاسیکی غزل کا باکمال شاعر: رشید احمد رشید' کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ بیدر میں غزل کا ایسا باکمال شاعر گزرا ہے جس کی غزل کو اردو کے بہترین کلاسیکی غزل گو شعرا کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔اس مضمون میں رشید احمد رشید کی شاعری کے محاسن اور ان کے فکر وفن کا تفصیل سے جائزہ لے کر مقبول احمد نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''یقیناً رشید احمد رشید ایک سچے فن کار اور بلند مرتبہ سخنور تھے۔فکر کی تازگی، تخیل کی بلندی، فن کی پختگی، زبان کے لطف اور بیان کے حسن کے اعتبار سے ان کی غزلیہ شاعری اردو کے کلاسیکی شعرا کے ذخیرے میں حسین اضافہ ہے......رشید احمد رشید کی غزل بلاشبہ اس معیار کی ہے کہ ہم انھیں فانی بدایونی، جلیل مانک پوری، صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی، حسرت موہانی، آرزو لکھنوی، اثر لکھنوی، سیماب اکبرآبادی اور جگر مرادآبادی کے پہلو بہ پہلو جگہ دے سکتے ہیں۔''(سخن شناسی، ص ۲۵)

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول خود رباعی کے مستند شاعر ہیں۔رباعی گو شعرا پر لکھے گئے مضامین ڈاکٹر مقبول احمد

کی صنفِ رباعی سے رغبت اور فنِ رباعی سے گہری واقفیت کی غمازی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں دو مضامین 'نادم بلخی کی رباعی گوئی کا فنی محاکمہ' اور 'نامی انصاری کی رباعیات کا تنقیدی جائزہ' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں مضامین ان کی عروض دانی اور زبان و بیان پر عبور کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مقبول نے ان دونوں مضامین میں نادم بلخی اور نامی انصاری کی عروضی، لسانی اور فنی خامیوں پر سخت گرفت کی ہے اور مدلل انداز سے اپنا موقف ظاہر کیا ہے۔ بقول مقبول احمد لفظ 'بھاؤ' (بمعنی نرخ) اور گھاو (بمعنی زخم) کا درست وزن 'فاع' ہے۔ اس کی سند کے طور پر انھوں نے داغ اور بہادر شاہ ظفر کے اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ مقبول احمد کا کہنا ہے کہ نادم بلخی نے ان دونوں لفظوں کو فعلن کے وزن پر باندھا ہے۔ نادم کی ان رباعیوں ۔

بھاؤ نہ رفاقت کا گراؤ بھائی احساسِ رقابت کو مٹاؤ بھائی
میرا نہ سہی ماں کا تو کہنا مانو ...... بھارت کا لہو تم نہ بہاؤ بھائی

سڑ سڑ کے مہکنے لگا گھاؤ بھائی ناسور نہ گھاؤ کو بناؤ بھائی
مرہم اسے درکار ہے مرہم دے دو مرہم کے عوض کچھ نہ لگاؤ بھائی

پر گرفت کرتے ہوئے مقبول احمد لکھتے ہیں:

''بھاؤ کی جگہ بہ آسانی 'قیمت' لایا جا سکتا تھا۔ چوتھے مصرعے میں 'تم' کلّی طور پر حشو ہے۔ 'تم' کی جگہ 'یوں' لایا جاتا تو مافی الضمیر بھی اچھی طرح اجاگر ہوتا......اسی طرح لفظ 'گھاؤ' بھی فاع کے وزن پر ہی درست ہے......لیکن نادم نے اس لفظ کو بھی فعلن کے وزن پر باندھا ہے۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ زخم سڑنے کے بعد اس میں خوش بو نہیں بلکہ بدبو پیدا ہوتی ہے۔ 'مہکنے لگا' کی جگہ 'رسنے لگا' کہتے تو بات بن جاتی۔'' (ص۸۷ تا۹۷)

نامی انصاری کی رباعیوں میں موجود عروضی، لسانی اور فنی خامیوں پر بھی گرفت کی ہے۔ مثلاً:

انسان فطرت سے کیسے راحت پائے پھیلیں نہ اگر برگ و شجر کے سائے
پانی کی تگ و دو ہے اصولِ فطرت دریا بہنے سے باز کیوں آئے

اس رباعی پر گرفت کرتے ہوئے مقبول احمد لکھتے ہیں:

''چوتھے مصرعے میں ایک سببِ خفیف کم ہے۔ یہ مصرع ساقط الوزن تو ہے ہی، غیر فصیح بھی ہے۔ 'باز آئے' کے درمیان 'کیوں' کی مداخلت مناسب نہیں۔ سامنے کی بات ہے 'کیوں باز آئے' کہہ دیا جاتا۔ پانی کے بہاؤ کے لیے لفظ 'تگ و دو' کا استعمال بھی محلِ نظر ہے۔ 'دریا

کی روانی ہے اصولِ فطرت' کہہ دیا جاتا تو مصرع عیب سے پاک ہوجاتا۔''(ص ۱۰۲)

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول ایک اچھے تجزیہ نگار اور مبصر بھی ہیں۔ان کے تبصرے بھی اپنے اندر تنقیدی شان رکھتے ہیں۔ان کی تصنیف 'محاکمہ' اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔یہ کتاب مختلف کتابوں کے تجزیوں اور تبصروں پر مشتمل ہے۔مقبول احمد تبصرہ نگاری کے فن اور اس کے تقاضوں سے بخوبی واقف ہیں۔موصوف اپنے تبصرے میں زیرِ تبصرہ کتاب کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔جہاں قابلِ تحسین بات ہو اس کی تحسین و ستائش کرتے ہیں اور جہاں کوئی علمی اور فنی کمزوری ہو معقول انداز میں اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔یہی نہیں بلکہ کتاب کی اہمیت وافادیت کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔مقبول احمد کے تبصروں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ جب تک کتاب کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ نہ کرلیں اس وقت تک تبصرہ قلم بند نہیں کرتے۔وہ اپنے تبصروں میں کتاب کے تمام حسن و قبح کا غیر جانب داری کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مقبول احمد مقبول نے جہاں شعر و سخن کے میدان میں اپنے نمایاں نقوش ثبت کیے ہیں وہیں تنقید کی دنیا میں بھی اپنا نام روشن کیا ہے۔وہ بہترین شاعر کے ساتھ ساتھ اچھے نثر نگار بھی ہیں۔یہ دونوں صلاحیتیں بہت کم کسی میں یکجا ہوتی ہیں۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مقبول احمد ادب کی دنیا کے خوش نصیب انسان ہیں کہ انھیں نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل ہے۔



ڈاکٹر عتیق الرحمن
شعبۂ عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات، وشو بھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن، مغربی بنگال، رابطہ نمبر: 9635193411

اثرؔ انصاری بحیثیت نثر نگار

تلخیص:

اثر انصاری اردو دنیا کی جانی مانی شخصیت ہیں۔ خواہ وہ نثر ہو چاہے نظم دونوں میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ یوں تو اثر انصاری نے زیادہ زور آزمائی شاعری میں کی ہے اور ان کی زیادہ تر کتابیں شعری مجموعہ کی شکل میں اہل علم وفن سے داد وتحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اگر چہ نثری خصوصیت پر نگاہ ڈالیں تو ہم اس نتیجے پر آتے ہیں کہ ان کی نثری خدمات بھی پایہ کی ہیں اور اس کی سب سے بڑی مثال ان کی کتاب 'دبستان شبلی کے نامور انشا پرداز' ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری کتابیں 'تذکرۂ سخنوران مئو'، 'اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی' اور 'سفرج کے شب وروز' اور ان کی مذکورہ سبھی کتابیں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس طرح سے اس مضمون میں اثر انصاری کی نثری خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ:

اثرؔ انصاری، سفرج کے شب وروز، تذکرۂ سخنوران مئو، دبستان شبلی کے نامور انشا پرداز، اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی۔

''اثرؔ انصاری کا پورا نام ابو بکر انصاری تھا اور ان کی پیدائش ۱۹۲۳ء میں اتر پردیش، مئو ناتھ بھنجن کے ایک مردم خیز اور علمی گھرانے میں ہوئی۔ مشرقی اتر پردیش کا معروف صنعتی شہر مئو ناتھ بھنجن جو علمی، تہذیبی اور تاریخی اعتبار سے ایک انفرادی اہمیت کا حامل رہا ہے، علم وفضل کے لحاظ سے بھی یہ زمین کافی زرخیز رہی ہے۔ یہاں بڑے بڑے علما، فضلا، دانشور اور ادبا پیدا ہوئے اور اپنے علمی وادبی کارناموں کی بدولت پوری دنیا میں اپنی شہرت ومقبولیت کے ساتھ ہی اس شہر کا نام بھی روشن کیے ہوئے ہیں۔ اثرؔ

صاحب طالب علمی کے زمانے سے ہی ذہین اور وطن پرست تھے۔ کہتے ہیں کہ انسان کی عظمت کا اندازہ ان کے گرد جمع احباب کی شخصیت سے لگایا جاتا ہے، اثرؔ انصاری کو اس بات کا فخر ان کی زندگی میں حاصل ہو گیا تھا کہ ان کی علمی و ادبی خدمات پر مبنی ایک 'تحقیقی' کارنامہ مکمل کر لیا گیا۔ اور یہ کارِ نمایاں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب نے بڑی محنت، لگن اور خوش اسلوبی سے انجام دیا اور اثرؔ صاحب کی نثری اور شعری شخصیت و فن کو منظر عام پر لانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے جس کو ادبی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ (اثرؔ انصای پر چند تحریریں، ص ۷۳)

ابوبکر اثرؔ انصاری اردو کے ایک ایسے مایہ ناز ادیب اور شاعر ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی اردو شعر و ادب کی بے لوث اور پر خلوص خدمت میں گزار دی اور کسی بھی صلہ و ستائش اور شہرت و ناموری کی تمنا کے بغیر خاموشی سے تقریباً ساٹھ سالوں تک اردو زبان و ادب اور شعر و شاعری کے گیسو سنوارنے میں لگے رہے۔ اثرؔ انصاری اردو کے ایک منفرد ادیب، خوش فکر شاعر اور صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ یوں تو اثرؔ انصاری نے بھی دوسرے شعرا کی طرح اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا ہے لیکن شاعری کے ساتھ ساتھ اثر انصاری نے نثر نگاری میں بھی کافی نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں، بنابریں ان کے پانچ شعری مجموعے کم و کیف (۱۹۷۴ء)، افکار پریشاں (۱۹۸۰ء)، زبانِ غزل (۱۹۸۷ء)، آئینہ در آئینہ (۱۹۹۲ء)، پیراہن گل (۱۹۹۷ء) اور نوائے سروش (۲۰۰۱ء) منظر عام پر آئے اور علمی اور ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے اور اردو زبان و ادب کے شعری سرمائے میں اضافے کا سبب بنے۔

اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے 'سفرِ حج کے شب و روز' (۱۹۸۰ء)، 'تذکرۂ سخنورانِ مئو' (۱۹۸۱ء)، 'دبستانِ شبلی کے نامور انشا پرداز' (۱۹۹۰ء) اور اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی (۲۰۰۰ء) جیسی قابل قدر تصنیفات یادگار چھوڑیں۔

اثرؔ انصاری کی تذکرہ نگاری کا جائزہ لینے سے قبل اردو تذکرہ نگاری کا اجمالاً تاریخی جائزہ ضروری ہے کیوں کہ اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت بہت پرانی ہونے کے ساتھ ساتھ کافی توانا بھی ہے۔ اردو شاعری کی طرح اردو تذکرہ نگاری بھی فارسی کی رہین منت ہے اور اردو کے تذکرے ایک عرصہ تک فارسی طرز پر لکھے گئے بلکہ اس کی زبان بھی فارسی رہی ہے۔ اردو کا اولین تذکرہ جو اب تک دستیاب ہو سکا ہے وہ میر تقی میرؔ کا 'نکات الشعرا' ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے قبل اردو شعرا کے تذکرے نہیں لکھے گئے۔ اس سے پہلے کے بہت سے تذکرے نایاب ہیں 'گلشن گفتار' حمید اورنگ آبادی اور 'تحفۃ الشعرا' بھی میرؔ کے ہی زمانے میں لکھے گئے۔ یہ تینوں تذکرے ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء میں مرتب ہوئے اور ان تینوں

تذکروں میں 'نکات الشعرا'، گلشن گفتار' اور 'تحفۃ الشعرا' کی زبان فارسی ہے کیوں کہ اس زمانہ تک فارسی ہندوستان کی دفتری زبان کے علاوہ علمی اور ادبی زبان کی بھی حیثیت سے مستعمل تھی۔ ان کی نثری تصنیفات کا جائزہ ذیل میں لیا جارہا ہے۔

۱۔ سفرِ حج کے شب وروز: یہ اثرؔ انصاری کی پہلی نثری تصنیف ہے جو ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ دراصل ان کے پہلے سفرِ حج (۱۹۷۹ء) کا سفر نامہ ہے جس میں انھوں نے ایام حج کے حالات بڑے دل کش انداز میں قلم بند کیے ہیں۔ 'سفرِ حج کے شب وروز' اثرؔ انصاری کے سفرِ حج کی روداد ہے جو تاریخ وار ڈائری کے طرز پر تحریر کی گئی ہے اور ۱۹۸۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اگرچہ سفر کو وسیلہ ظفر کہا گیا ہے لیکن زیارت حرمین شریفین اور حج بیت اللہ کا کیا کہنا۔ مومن کی زندگی کی یادگار گھڑیوں میں ایام حج کا شمار ہوتا ہے۔ لاکھوں حجاج کرام اگرچہ فریضہ حج سے سرفراز ہوتے ہیں لیکن بہت مختصر تعداد ایسے حجاج کی ہوتی ہے جن کو دیار حرم میں گزارے ہوئے لمحات کو قلم بند کرنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ عقیدت، احترام اور اظہار عبودیت کے جذبات ہر مومن کے دل میں موجزن ہوتے ہیں لیکن جو حضرات اسے احاطہ تحریر میں لاتے ہیں ان کے افکار و مشاہدات محفوظ بھی ہو جاتے ہیں اور آئندہ کے لیے تاریخی حوالے بھی بن جاتے ہیں۔

'زائرین حرم' کے نام سے منسوب اس کتاب میں اثرؔ انصاری نے سفرِ حج کے دوران کے واقعات کو تاریخ وار تحریر فرمایا ہے۔ اس سفر کو احاطہ تحریر میں لانے کے پیچھے اول تو ان کے دل کی تسلی کا معاملہ تھا اس سے زیادہ اہم یہ کہ دیارِ پاک کے عازمین تک ان کے مشاہدات بھی پہنچ جائیں۔ شاید ان کے کام کی باتیں بھی نکل آئیں۔ پھر یہ بھی کہ جو مومن اس پاک گھر کی زیارت سے اب تک محروم ہیں کم از کم اس تک اس کی ہلکی سی جھلک تو پہنچ جائے اور زیارت بیت اللہ کے جذبات اس کے دل میں بھی موجزن ہو جائیں۔

اس سفر نامۂ حج میں روزمرہ کی معلومات اسی قدر ہیں کہ کب طبیعت ناساز ہوئی، کون سی دوا لی۔ کتنا افاقہ ہوا، مئو سے تشریف لانے والے کن لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ حرم شریف میں حج کے ایام قریب آنے کے ساتھ کس قدر بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے۔ سواری یا پیدل کس طرح مختلف مقامات تک پہنچنا ہوتا ہے۔ چوالیس سال سے زیادہ کا وقفہ گزر جانے کے بعد آج حرم اور مقامات مقدسہ کی تعمیر و توسیع میں بہت اضافہ ہو چکا ہے پھر بھی ان پرانی معلومات کی اہمیت اب بھی باقی ہے۔

الغرض پورا سفر نامہ آسان و دلچسپ اور پرتاثیر پیرایہ میں تحریر کیا گیا ہے۔ ڈائری نما ہونے کی وجہ سے ہر روز کی سرگرمی اور مصروفیات و معمولات بھی ضبط میں آتے گئے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ سفر نامہ مصنف کے تصنیفی کاموں میں ایک خوش گوار اضافہ اور بہت ساری معلومات کا ذریعہ بھی ہے اس میں آپ بیتی بھی ہے

اور جگ بیتی بھی۔اسی باعث ہر مومن کو یہ کتاب یکساں طور پر متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

۲۔تذکرۂ سخنوران مئو: یہ اثرؔ انصاری کی دوسری نثری تصنیف ہے جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ مقامی شعرا کا تذکرہ بھی ہے اور مئو کی علمی، ادبی تاریخ بھی، بہت ممکن ہے کہ یہ مئو کا پہلا ادبی وشعری شناخت نامہ بھی ہو۔اثرؔ انصاری اردو کے ایک منفرد ادیب، خوش فکر شاعر اور صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ یوں تو اثرؔ انصاری نے دوسرے شعرا کی طرح اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا ہے لیکن شاعری کے ساتھ ساتھ اثرؔ انصاری نے نثر نگاری میں بھی کافی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے جس کی بہترین مثال ان کی کاوش تذکرۂ سخنوران مئو ہے۔ یہ کتاب اثرؔ انصاری کی دوسری نثری تصنیف ہے۔ان کی پہلی نثری تصنیف 'سفرِ حج کے شب وروز' جو دراصل اثرؔ انصاری کے پہلے سفرِ حج کی روداد ہے اور ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کے مطابق:

''اثرؔ انصاری نے سفرِ حج میں پیش آنے والے سرد و گرم واقعات وحالات کو سادہ اور دل کش انداز میں قلم بند کیا ہے اس سے اثرؔ انصاری کے اسلوب نگارش کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔''

اثرؔ انصاری کی نثری تصنیف 'تذکرۂ سخنوران مئو' اس بنا پر اور اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مئو کی علمی، ادبی تاریخ اور مئو کے اکیاون شعرا کا تذکرہ ہے۔اثرؔ انصاری نے اس کتاب میں شعرا کے تعارف میں بخل سے کام نہیں لیا ہے، انھوں نے شعرا کے مختصر تعارف کے ساتھ ساتھ ان کی فنی خوبیوں کو اپنے مخصوص اشاراتی اور شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے چنانچہ اپنے ہم عصر شاعر فضاؔ ابن فیضی کے سراپا کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''صاف رنگ، سوکھا کمزور بدن، موزوں قد، معصوم چہرہ، منکسر المزاج، آنکھوں پر دبیز شیشے کی عینک، پست آواز، بلند فکر ایک عہد آفریں شاعر جو برصغیر ہندو پاک کے لیے محتاج تعارف......نظموں اور غزلوں میں آپ کے جدید تجربے نئی نئی ترکیبیں، خوب صورت بندشیں، دلآویز تشبیہیں اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔''

تذکرہ نگاری اردو زبان کی ایک ایسی مختلف النوع صنف ہے جس میں سیرت وسوانح کے ساتھ ساتھ ادب اور تنقید وتحقیق کے مشترکہ اوصاف پائے جاتے ہیں اس لحاظ سے دیکھا جائے تو 'تذکرۂ سخنوران مئو' ایک کامیاب تذکرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہی اثرؔ انصاری کی تنقید وتحقیق کا آئینہ دار بن گیا ہے۔ اثرؔ انصاری نے اس تذکرہ میں غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے معاصرانہ چشمک سے اوپر اٹھ کر پوری ایمانداری ودیانتداری کے ساتھ شعرا کی سیرت، سوانح، تعارف اور تذکرہ وموضوع وفن کے ساتھ انصاف کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور توازن واعتدال کے دامن کو ہر حال میں تھامے رکھا ہے اور یہی اس

تذکرہ کی امتیازی خصوصیت بھی ہے۔

یوں تو 'تذکرہ سخنورانِ مئو' ۱۹۷۲ء میں ترتیب دیا گیا تھا لیکن یہ طویل عرصہ کے بعد ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا۔ اثرؔ انصاری نے اگر تھوڑی توجہ کی ہوتی تو یہ تذکرہ اردو تاریخ میں ایک ادبی اہمیت کا حامل بن جاتا۔ مگر اثرؔ انصاری کی عدیم الفرصتی اور عدم توجہی کے سبب اس کی ادبی حیثیت بین ملکی کے بجائے مقامی ہوکر رہ گئی اور اس تذکرہ کو ادبی حیثیت نصیب نہ ہوئی جو بیسویں صدی کے تصنیف کردہ اس تذکرہ میں ہونی چاہیے۔ چنانچہ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی رقم طراز ہیں:

''اثرؔ انصاری صاحب کے تذکرہ کا مقصد محدود ہے، انھوں نے اس کام کو منصوبہ بند طور پر نہیں کیا اور نہ ہی اس کے کینوا س میں وسعت و ہمہ گیری کی شعوری کوشش کی اور نہ ہی عصری تقاضوں کے مطابق جدید رنگ آمیزی سے کام لیا جس سے اس کی افادیت محدود ہوکر رہ گئی پھر بھی اس تذکرہ میں جتنا کچھ بھی موجود ہے وہ اہم ہے اور اردو غزل کے ایک ممتاز ترین شاعر کی کاوش کا نتیجہ ہے۔''

'تذکرہ سخنورانِ مئو' بہر حال مجموعی طور پر اثرؔ انصاری کا ایک ایسا قابل ستائش کارنامہ ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس تذکرہ میں جن شعرا کا ذکر ہے اور جس زمانے کے حالات اور علاقے کا تذکرہ ہے یہ ان سب کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے، بنا بریں اس تذکرہ کی ادبی، تاریخی، تنقیدی اہمیت وافادیت سے انکار ممکن نہیں۔

اثرؔ انصاری کی تذکرہ نگاری کا اہم ترین حصہ اس کی تنقید ہے لیکن شعرا کے کلام پر تنقید کرتے وقت اثرؔ انصاری بے جا اختصار سے کام لیتے ہیں۔ ان کی مختصر ترین تنقیدی رائے ان کے مشرقی انداز نقد کا بھی پتہ دیتی ہے۔ مشرقی انداز تنقید میں زبان، اسلوب بیان، سلاست وروانی اور برجستگی کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن ان کی اس مشرقی تنقید سے شعرا کے کلام کے حسن وقبح پر پردہ نہیں پڑتا بلکہ اس کی خوبیاں اور خامیاں واضح ہو جاتی ہیں اور جیسا کہ پروفیسر کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ تنقید کا کام کلام کی خامیوں اور خوبیوں پر پردہ ڈالنا نہیں بلکہ اس کو واضح کر دینا ہے۔

۳۔ دبستانِ شبلی کے نامور انشا پرداز: یہ اثرؔ انصاری کی تیسری نثری تصنیف ہے جو ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی اور جس میں دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے وابستہ اہم علمی اور ادبی شخصیات کے تصنیفی کارناموں کا تعارف ہے اور ان پر سیر حاصل بحث کے ساتھ ان کے علمی اور ادبی مقام و مرتبے کے تعین کی کامیاب کوشش ہے جو اثرؔ انصاری کی سادہ و پرکار نثر نگاری اور ان کی تخلیقی اور تنقیدی نظر کا عمدہ نمونہ ہے۔

'دبستان شبلی کے نامور انشا پرداز' کا دائرہ محدود ہے، جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کتاب میں دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے تعلق رکھنے والے معدودے چند ادیبوں کے حالات اور ان کی تصنیفات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ مزید برآں عرض طلب میں بھی خاص طور پر اختصار سے کام لیا گیا ہے، جس کی وجہ شاید مصنف کی خراب صحت ہے ورنہ مذکورہ لوگوں کے علاوہ دیگر ادبا و رفقائے دارالمصنّفین کو بھی بلاشبہہ نہ صرف اس میں شامل کیا جا سکتا تھا بلکہ شامل کیا جانا چاہیے تھا، اور ان کے کمالات وطرز نگارش اور تصنیفات وتخلیقات سے بھی سیر حاصل بحث کی جا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں اثر صاحب کی منشا بھی یہی تھی لیکن خرابی صحت اور عوارض کے مسلسل حملوں نے حسب خواہش اس کی تکمیل نہیں ہونے دی۔

مختصر نگاری کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن اپنے مافی الضمیر کو چند لفظوں میں اس طرح ادا کر دینا کہ متعلقہ موضوع کی تمام اہم کاوشوں پر کماحقہ روشنی پڑتی ہو اور تشنگی کا احساس نہ ہوا انتہائی مشکل امر ہے، جس سے ہر کوئی عہدہ برآ نہیں ہو پاتا اور یہی ایجاز و جامعیت ہی اس کتاب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل چھ ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: علامہ شبلی نعمانی

باب دوم: مولانا سید سلیمان ندوی

باب سوم: مولانا عبدالسلام ندوی

باب چہارم: پروفیسر نجیب اشرف ندوی

باب پنجم: مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

باب ششم: سید صباح الدین عبدالرحمان

ہر فن کار کے اندر ایک نقاد پوشیدہ ہوتا ہے جو اس کی نگارشات اور فن پاروں کی تراش خراش کر کے اسے بہترین شکل دینے میں اس کی مدد کرتا ہے اور قبول کے مشکل ترین مراحل طے کرنے میں بھی کسی تخلیق کار کا یہی شعور کارفرما ہوتا ہے۔ جس کے اندر یہ تنقیدی شعور جس قدر نکھرا ہوا اور اعلیٰ ہوگا اس کی نگارشات بھی اتنی ہی رچی اور دل کش ہوں گی۔ 'دبستان شبلی کے نامور انشا پرداز' سے اثر انصاری کے اعلیٰ اور واضح ناقدانہ شعور کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان کے تنقیدی نظریات اور عملی ونظری تنقید کے بہترین نمونے اوپر گزر چکے ہیں۔ تاہم یہاں ایک اور اقتباس بطور خاص ملاحظہ کے لائق ہے، جس سے ان کے ناقدانہ شعور کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ مولانا عبدالسلام ندوی کے تصورات نقد اور ان کے ادبی وعلمی کارناموں کا جائزہ ان الفاظ میں لیتے ہیں:

''مولانا کا شعری اور ادبی ذوق قدیم شاعری کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اب جدید رجحانات نے شعر وادب میں جو وسعت پیدا کردی ہے وہ قابل قدر اضافہ ضرور ہے، لیکن بعض جدت پسندی، اہمال کی حدوں کو چھو رہی ہے۔

غرض کہ 'دبستان شبلی کے نامور انشا پرداز' اثرؔ انصاری صاحب کا ایک بہترین تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ہے، جو موضوع اور مواد کے لحاظ سے بھی، تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے بھی اردو کے علمی و ادبی خزانے اور بالخصوص شبلیات کے باب میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'اتر پردیش اردو اکادمی' نے اس تصنیف کی اہمیت وعظمت کا اعتراف کرتے ہوئے فاضل مصنف کو ۱۹۹۱ء میں اپنے مخصوص اعزاز سے سرفراز کیا۔'' (اثرؔ انصای پر چند تحریریں، ص ۱۷۵)

۴۔ اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی: یہ اثرؔ انصاری کی اہم ترین تنقیدی اور تحقیقی کتاب ہے جو ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اسے اگر اثرؔ انصاری کا نثری، تحقیقی اور تنقیدی شاہ کار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کتاب میں اثرؔ انصاری نے انتہائی عرق ریزی کے ساتھ اردو کی شعری تخلیقات کا انتخاب کر کے ہندو تہذیب، ہندو اساطیر اور ہندو دیو مالاؤں کا تذکرہ و تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی بالکل منفرد کتاب ہے۔ اس کتاب کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اثرؔ صاحب نے جہاں کسی شاعر کی کوئی نظم پیش کی ہے، وہیں اس نظم کی شرح بھی بیان کردی ہے جس سے قاری کو اس نظم کے موضوع کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے، اس نظم کے موضوع کے متعلق بنیادی جانکاریاں بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر نظیرؔ اکبرآبادی کی نظم 'بلدیو جی کا میلہ' کو ہی لے لیجیے کہ یہاں اس نظم کے کچھ اشعار نقل کیے جارہے ہیں۔

کیا وہ دلبر کوئی نویلا ہے   ناتھ ہے اور کہیں وہ چیلا ہے
موتیا ہے، چنبیلی، بیلا ہے   بھیڑ انبوہ ہے اکیلا ہے
ایک کیا کیا وہ کھیل کھیلا ہے   بھیڑ میں خلقتوں کا ریلا ہے
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے   زور بلدیو جی کا میلا ہے

وہیں اس نظم کے تعارف میں پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ: ''بلدیو جی کرشن چند کے بڑے بھائی کے نام پر میلا لگتا ہے، میلوں ٹھیلوں میں جو آدمیوں کی بھیڑ بھاڑ اور طرح طرح کے لوگ، طرح طرح کے سامانوں کی دکانیں، انواع واقسام کی کھانے پینے کی چیزیں فروخت ہوا کرتی ہیں، یہاں نوجوانوں اور جوڑوں کے غول نظر آتے ہیں، یہی ساری چیزیں نظیر نے اپنی اس ترجیع بند نظم میں پیش کی ہیں۔'' اثرؔ انصاری اپنی تنقید میں زبان و

بیان پر خاص توجہ دیتے ہیں لیکن شعرا کے کلام کی معنوی خصوصیات کو بھی کسی حال میں نظر انداز نہیں ہونے دیتے بلکہ وہ زبان و بیان کی جانچ پرکھ سے گزر کر کلام کی معنوی اور فنی خصوصیات پر تجزیاتی نظر بھی ڈالتے اور شعرا کے انتخاب کلام میں تنقیدی شعور سے کام لیتے ہوئے پوری ذمہ داری سے انتخاب کرتے ہیں۔ حالاں کہ انتخاب کلام تنقید نہیں ہوتا لیکن نقاد کی بصارت کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''انتخاب تنقید تو نہیں مگر انتخاب سے تنقیدی شعور ظاہر ہوتا ہے۔ انتخاب میں اپنی پسند سے زیادہ شاعری کی نمائندگی ضروری ہے اور شاعری کی نمائندگی آسان کام بھی نہیں ہے۔''

اثر انصاری کی تحریر کا اسلوب صاف، سادہ، سلیس، رواں اور ہر طرح کی عبارت آرائی سے پاک ہے اور یہی اسلوب تنقید نگاری کے لیے مناسب تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ رنگینی عبارت، تشبیہات و استعارات اور بھاری بھرکم الفاظ و تراکیب سے وہ اپنے مضمون کی روح کو تباہ نہیں ہونے دیتے جس سے ان کی نظری تنقید کے نمونے بالکل واضح انداز میں سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ 'تذکرۂ سخنوران مئو' میں اثر انصاری کی نظری تنقید کے جو نمونے ملتے ہیں وہ ان کے تنقیدی معیار کا خود تعین بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے تذکرہ میں شعرا کے کلام پر تنقید کرتے وقت اپنی جمالیاتی حس اور کلاسیکی مزاج کے پیش نظر کچھ ایسے تنقیدی اشارے بھی کر جاتے ہیں جو ان کے تنقیدی معیار کو مزید بلند کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کے تذکرہ کی تنقید کا معیار کسی طرح اردو تذکروں میں پائی جانے والی تنقید سے کمتر نہیں ہے۔



منابع و مآخذ:

۱۔ اثر انصاری: حیات اور خدمات، ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن، ۲۰۰۷ء
۲۔ اثر انصاری فکر و فن کے آئینے میں، ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی، نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن، ۱۹۹۸ء
۳۔ اثر انصاری پر چند تحریریں، ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن، ۲۰۱۱ء
۴۔ تذکرۂ سخنوران مئو، اثر انصاری، نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن، ۱۹۹۱ء
۵۔ دبستان شبلی کے نامور انشا پرداز، اثر انصاری، نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن، ۱۹۹۰ء
۶۔ سفر حج کے شب و روز، اثر انصاری، نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن، ۱۹۸۰ء
۷۔ اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی، اثر انصاری، نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن، ۲۰۰۰ء



ڈاکٹر ناظر حسین خان
کرائسٹ چرچ کالج، کان پور، رابطہ نمبر:9935276442

اسعدؔ بدایونی کی غزلوں میں کربلائی عناصر

تلخیص:

اسعدؔ بدایونی نے اپنے شعری کارخانے میں ہر طرح کے مضامین کو موضوع بنایا ہے۔ خواہ جدیدیت کی بات ہو یا مابعد جدیدیت کی، موت کی حقیقت ہو یا انانیت کی، داستانی غزلوں کی بات ہو یا میدان کربلا کے عناصر کی، ہر طرح کے مضامین پر اشعار ان کے کلیات میں دیکھنے کو ملتے ہیں اور اسعد ان کا استعمال اپنی خواہش کے مطابق جیسے چاہیں کر لیتے ہیں، غالباً اسی بنیاد پر اسعد نے کہا ہے کہ ''اور مضمون تو چوکھٹ پہ پڑے رہتے ہیں'' مثلاً ہر طرح کے مضامین پر میں طبع آزمائی کر سکتا ہوں۔

انھوں نے اپنی شاعری میں کچھ نہ کچھ ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جن کے ذریعے ہمارے ذہن میں کربلا کے واقعات گردش کرنے لگتے ہیں۔ اگر سرسری طور پر اس مضمون کا جائزہ لیں تو یہ پتا چلتا ہے کہ شاعر کے یہ اشعار معرکۂ کربلا سے لے کر موجودہ وقت تک کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں مشابہت رکھتے ہیں۔ خواہ بات منافقت کی ہو یا غداری یا لالچ کی، ہر دور میں ایسے لوگ زندہ رہے ہیں اور رہتی دنیا تک ایسے لوگوں کا وجود باقی رہے گا۔

کلیدی الفاظ:

اسعدؔ بدایونی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، کربلائی عناصر، واقعات کربلا، واقعات کربلا سے اثر پذیری۔

ہاتھ باندھے ہوئے الفاظ کھڑے رہتے ہیں
اور مضمون تو چوکھٹ پہ پڑے رہتے ہیں

اسعدؔ بدایونی کا یہ شعر اصل میں تعلّی کا شعر ہے جس کے ذریعے اسعد یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں جس طرح کے اشعار کہنا چاہوں کہہ سکتا ہوں، جس طرح کے الفاظ استعمال کرنا چاہوں کر سکتا ہوں، کیوں کہ

جب بھی میں کوئی شعر کہنا شروع کرتا ہوں تو اس وقت ہر طرح کے الفاظ اور مضامین کی آورد میرے ذہن میں ہوتا رہتا ہے۔ ہر طرح کے مضامین کی آورد کا یہ سلسلہ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سبھی الفاظ اور مضامین میری چوکھٹ پر ہمہ وقت پڑے رہتے ہیں۔ لفظ 'پڑے رہتے ہیں' سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسعد کے ہاں مضامین کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اردو ادب میں تعلّی کی یہ روایت میر تقی میرؔ سے لے کر جدید دور کے شعرا تک دیکھی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کریں۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا
میرؔ

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور
غالبؔ

نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں
میر انیسؔ

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو!
جب بھی ان کو دھیان آئے گا تم نے فراق کو دیکھا ہے
فراقؔ

مذکورہ بالا اشعار کا تعلق اس مضمون کے عنوان سے تو نہیں ہے مگر جب ہم اسعد کے کلیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا پتا چلتا ہے کہ واقعی اسعد نے اپنے شعری کارخانے میں ہر طرح کے مضامین کو موضوع بنایا ہے۔ خواہ جدیدیت کی بات ہو یا مابعد جدیدیت کی، موت کی حقیقت ہو یا انانیت کی، داستانی غزلوں کی بات ہو یا میدان کربلا کے عناصر کی ہر طرح کے مضامین پر اشعار ان کے کلیات میں دیکھنے کو ملتے ہیں اور اسعد ان کا استعمال اپنی خواہش کے مطابق جیسے چاہیں کر لیتے ہیں، غالباً اسی بنیاد پر اسعد نے کہا ہے کہ 'اور مضمون تو چوکھٹ پہ پڑے رہتے ہیں' مثلاً ہر طرح کے مضامین پر میں طبع آزمائی کرسکتا ہوں۔ انھیں مضامین میں سے ایک موضوع کربلائی علامت کو یہاں بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔

سارے خیمے خاک سے اٹ گئے ہوگئی رن میں شام

ایک کہانی، ایک حقیقت، صدیوں سے ہے عام

اس شعر کو پڑھتے ہوئے ہم میدان کربلا کے واقعات کو اپنے ذہن میں رکھیں کہ کس طرح محض ۷۲ کے خلاف ہزاروں کی لشکر آرائی تھی۔ جنگ کے آخری دن امام حسین کی شہادت کے بعد کس طرح آپ کے خیموں کو دشمنوں کی جانب سے گھوڑوں سے روندا گیا، جب ہزاروں گھڑسواروں نے ریگستان میں موجود آپ کے خیمے کو روندا، جب دشمنوں کے ذریعے آپ کے خیمے کے اردگرد ہزاروں گھوڑے دوڑائے گئے تو ریگستان کی تمام ریت گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑنے لگیں، جس سے ہر طرف دھول ہی دھول ہونے کی وجہ سے چاروں طرف اندھیرا سا دکھائی دینے لگا، ہر طرف خاک اڑنے لگی، ایسی خاک کہ اس میں کچھ بھی نظر آنا مشکل ہو گیا۔ شاعر نے اسی منظر کو پہلے مصرعے میں باندھنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے مصرع 'ایک کہانی ایک حقیقت صدیوں سے ہے عام' سے شاعر یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ میدان کربلا کی بہت ساری باتیں آج بھی دنیا کے لوگوں کو بتائی جاتی ہیں کہ کس طرح سے امام اور ان کے ۷۲ رلوگوں پر ظلم ڈھائے گئے، کیسے ان حق پرست لوگوں کو پریشان کیا گیا، ان کو شہید کر کے ان کی لاشوں کے ساتھ بے حرمتی کی گئی اور ان کے خیمے کی عورتوں کے سروں کو ننگا کر کے پورے شہر میں گھمایا گیا۔ ایسی بہت سی باتیں جو عوام کو صدیوں سے بتائی جا رہی ہیں، شاعر بھی اپنی شاعری میں کربلا کے ان واقعات کو علامتوں کے ذریعے استعمال کر کے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نہ صرف اسعد بلکہ اردو کے دیگر شعرا کے ہاں (بالخصوص مرثیہ کے شاعر) بھی اس طرح کی علامتوں مثلاً نیزے پر سر کا ہونا، خواتین کے سر سے دوپٹا ہٹا کر پورے شہر میں ننگے سر گھمانا، پانی کی کمی کا استعارہ، سجدے میں سر کے کٹنے کا ذکر، شیر خوار بچے پر تیر لگنے کا ذکر اور شہر کوفہ کی منافقت وغیرہ ان تمام واقعات کا ذکر یا تو علامتوں کے ذریعے یا پھر استعاروں کے ذریعے کہیں نہ کہیں دیکھنے کو ملتا ہے، نہ صرف اردو بلکہ ہندی زبان کے شعرا بھی ان علامتوں کا استعمال کر اپنی شاعری میں کربلا کے واقعات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اسی کی طرف شاعر دوسرے مصرعے میں اشارہ کرتا ہے۔ آیئے اسعد کے کچھ ایسے اشعار ملاحظہ کریں جس میں شہر کوفہ والوں کی غداری کو موضوع بنایا گیا ہے ۔

سوز غم حسین و حسن چھوڑ جاؤں گا — میں کوفۂ نفاق و ندامت میں یادگار

منافقت میں تو یہ شہر بھی مثالی ہے — تمام کوفہ و بغداد استعارے ہیں

زندہ ہماری شعلہ بیانی ہے اور ہم — شہر منافقاں میں رہائش کے باوجود

شہر کوفہ کی مکاریوں اور دغابازیوں کو اردو کے دیگر شعرا نے بھی اپنے یہاں موضوع بنایا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کریں ۔

ذرّہ ذرّہ مرے لیے کوفہ زندگی ورغلا رہی ہے مجھے
مظفر حنفی

آستیں سانپوں کی پہنیں گے گلے میں مالا اہل کوفہ کو نئی شہر پناہی دیں گے
پروین شاکر

ہمارے شہر کے احوال مت پوچھ ہمارا شہر کوفہ بن رہا ہے
سعدیہ صفدر سعدی

عجیب شہر ہے کوفہ مزاج لوگوں کا کوئی بھی شخص قرین وفا نہیں ملتا
شعیب بخاری

شہر کوفہ کے باشندوں کے حوالے سے مشہور ہے کہ ان لوگوں نے پہلے تو امام حسین کو بیعت کے لیے کوفہ آنے کی دعوت دی اور جب امام حسین ان کی باتوں پر اعتبار کر کے کوفہ شہر تشریف لے جا رہے تھے تب آپ کو ان کی مکاری کا علم ہوا اور پھر یہ بھی پتا چلا کہ شہر کوفہ کے لوگ آپ کا ساتھ نہیں دیں گے تو آپ کو بہت مایوسی ہوئی۔ شاعر نے آپ کی اسی مایوسی کو شعر کی قالب میں یوں ڈھالا ہے۔

جب قریب آئے تو الجھن کا سبب بھی نکلے جتنے چہرے تھے پس گرد و غبار اچھے تھے
یہ لوگ خواب بہت کربلا کے دیکھتے ہیں مگر غنیم کو گردن جھکا کے دیکھتے ہیں
عجیب دور ہے یہ جس میں سارے دانشور دلوں کو تنگ مکاں کو کشادہ کرتے ہیں
بخارا و بغداد و بصرہ کے بعد کسی کربلا کی طرف جاؤں گا
جو کوچے اہل محبت کے نام سے تھے وہاں ہر ایک در پہ صدا میں نے دی یہاں کوئی ہے
پرانے طاق میں رکھی کتاب سے پوچھو بزرگ کیا تھے بزرگوں کی نیک نامی کیا
عدو کے سامنے سارا قبیلہ چپ کیوں ہے سبھی نے ڈال لیا حلقۂ غلامی کیا
تمام شہر پہنتا ہے مصلحت کی زرہ یہاں کرے میرا انداز بے نیامی کیا
جو شہ وقت کے قدموں کو نہ چھو پائی ہو کیا کوئی ایک بھی دستار علاقے میں نہیں

ان تمام اشعار کے ذریعے شاعر اشاروں میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مثلاً امام حسین کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا گیا مگر جب ضرورت پڑی تب لوگوں کی اصلیت ظاہر ہونے لگی۔ وعدہ کر کے وعدہ خلافی کرنا، یہ رویہ نہ صرف عام لوگوں کا تھا بلکہ پورے شہر کا تھا، خواہ وہ غریب رہے ہوں یا امیر، غیر تعلیم یافتہ لوگ رہے ہوں یا پھر تعلیم یافتہ لوگ سبھی لوگوں نے ڈر کی وجہ سے منافقت کی چادر اوڑھ لی۔ شاعر اپنے شعر کے

ذریعے یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ امام حسین نے ہر اس دروازے پر دستک دی جہاں پر آپ کو تھوڑی بھی امید تھی مگر ان کی امید کو بہت بڑی ٹھیس لگی جب کسی نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ لوگوں نے یا تو بادشاہ وقت کا ڈر یا پھر عہدے کی لالچ کی وجہ سے اپنے آپ کو یزید کے سپرد کر دیا تھا۔ شہر کا کوئی بھی گھر ایسا نہیں تھا جو اس ڈر یا لالچ کا شکار نہ ہوا ہو۔

شاعر کے ان تمام اشعار کو قاری صرف کربلا تک محدود نہ رکھیں، ان کے معنی کو وسیع طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم ان تمام اشعار کا مطالعہ بغور کریں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں منافقت اور لالچ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ منافقت اور لالچ کی یہ وبا ہر دور میں رہی ہے اور خوب رہی ہے۔ منافقت کے لفظی معنی ہیں ''ظاہر میں دوستی باطن میں دشمنی''، جس وقت یہ اشعار لکھے گئے اس وقت ادبی منظر نامے پر جدیدیت اور مابعد جدیدیت ایک دوسرے کے مدمقابل تھے، ایسی صورت میں دونوں ہی طرف کے لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف قلمی جنگ چھیڑ رکھی تھی، اس جنگ میں بہت سے لوگ کھل کر محاذ آرائی کر رہے تھے تو وہیں کچھ لوگ منافقت کا رویہ اختیار کر رہے تھے، اسی میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو لالچ کے سبب خاموشی اختیار کر حکومت کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ ظاہر ہے شاعر کو ایسے کچھ لوگوں کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا جن کا ذکر شاعر نے اپنے اشعار میں کیا ہے۔ ان باتوں کو مدنظر رکھ کر اگر ہم ان اشعار کا مطالعہ کریں تو یہ اشعار نہ صرف امام حسین کے وقت میں شہر کوفہ والوں پر صادق آتے ہیں بلکہ ہر دور میں منافقوں کی کرتوتوں پر صادق آئیں گے۔ اس لیے اسعد کے یہ اشعار اردو ادب میں مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ چند اور مثالیں ملاحظہ کریں جن میں کربلا کی نشانیاں دیکھنے کو ملتی ہیں ۔

سوائے سر کی قطاروں کے اور کیا دیکھا　　کسی محاذ پر فوجوں کا روبرو ہونا
ابھی ان نیزوں کی تشکیل میں ہے کتنی دیر　　جن پر اک روز یقیناً مرا سر ہونا ہے
اپنے بازو ہی علم کرنا ہیں ہر مقتل میں　　اپنا سینہ ہی بہر حال سپر ہونا ہے
مجھے بھی حکم ملے جان سے گزرنے کا　　میں انتظار میں ہوں شہسوار میں بھی ہوں

ان اشعار کے مطالعے سے پتا چل رہا ہے کہ کربلا کے میدان میں جنگ کی تیاری چل رہی ہے، فوج حملہ کرنے کی فکر میں ہے، اپنے ہتھیاروں کو تیار کرنا، گھوڑوں کو تیار رکھنا، ہر طرف فوج کا دکھائی دینا یہ سب قاری کے سامنے جنگ کی ایک تصویر پیش کرتا ہے۔ شاعر کو یہ جنگ ہر دور میں دکھائی دے رہی ہے خواہ وہ امام حسین کا دور رہا ہو، شاعر کا یا پھر کوئی اور یہ جنگیں اپنی شکلیں تبدیل کر ہر دور میں انسانوں کے سامنے ان کا امتحان لینے کے لیے آتی رہتی ہیں۔ دوسرے شعر میں شاعر اپنے خلاف ہو رہی سازشوں کا

موازنہ امام حسین کے خلاف میدان کربلا میں ہو رہی سازشوں سے کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ جس طرح امام حسین کو میدان کربلا میں سازشوں کا شکار کر انھیں شہید کر کے ان کے سر کو نیزے کی نوک پر پورے شہر میں گھمایا گیا مجھے پورا یقین ہے کہ ایک دن ایسے ہی میری عصمت اور وقار کو بھی سرِ عام کیا جائے گا۔

گروہ بندی اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کا یہ سلسلہ ہر دور میں رہا ہے اور اس دنیا کا انسان جب بھی اسی دنیا میں رہنے والے اپنے ہم جنس بھائیوں کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے تو ایسی ہی گٹ بندی، گروہ بندی اور اسی طرح کی محاذ آرائی کرتا ہے۔ موجودہ وقت اور قدیم زمانے کی ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی انسانوں کی اس خصلت کو اگر قاری مدنظر رکھتے ہوئے ان کا موازنہ کرے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقت بدلا ہے پر لوگوں کی سوچ نہیں بدلی، انسان آج بھی اسی طرح کی سوچ کا استعمال کرتے ہوئے اپنی خواہشوں کو انجام دے رہا ہے، ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہم آج بھی ایسے ہی لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں، ہمارے اردگرد آج بھی وہی جھوٹ اور مکاری گردش کر رہی ہے جس کی وجہ سے آج بھی کبھی کبھی سچ کو کچھ وقت کے لیے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ آیئے اب شاعر کے ایسے اشعار کو ملاحظہ کریں جن میں اس نے کربلا کے منظر کو پیش کیا ہے۔

کسی رن میں ساتھ حسین کا دیں کسی نہر سے پانی لے آئیں
اس شہر کے سارے نوحہ گر کوئی ایسی بھول نہیں کرتے

ریگ مقتل کو سجایا ترے دیوانوں نے
وار سارے تری تلوار کے کاری نکلے

سنو چراغ بجھا دو تمام خیمے کے
مرے عزیز شب امتحاں کی زد میں ہیں

ہر طرف بے رنگ آوازوں کی فوجیں خیمہ زن
ایک بھی آہٹ ہماری دسترس میں کیوں نہیں

دشت حالات میں وقت کے لشکری اپنی اپنی کمانیں سنبھالے ہوئے
میرے اسپ صبا کی پذیرائیاں ظالموں کا ہر اک تیر کرتا ہوا

بہت سے نیزے یہاں خود میری تلاش میں ہیں
یہ دشت جس میں برائے شکار میں بھی ہوں

کہتے ہیں لوگ شہر تو یہ بھی خدا کا ہے
منظر یہاں تمام مگر کربلا کا ہے

ستم گروں کا قبیلہ کہیں قریب ہی ہے
دعا کے زرد پرندے ادھر سے آتے ہیں

یزید عصر کہیں راستے میں مر جائے
خدا کرے نہ کوئی کربلا ادھر آئے

اسعدؔ کے یہ تمام اشعار کہیں نہ کہیں کربلا کے لوگوں یا وہاں کے مناظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلا شعر بظاہر تو کربلا کا منظر پیش کر رہا ہے مگر اس میں موجودہ وقت کے لوگوں پر طنز بھی کیا گیا ہے کہ آج کے لوگ

صرف اور صرف ناانصافیوں کا رونا روتے ہیں، کوئی بھی حق پرستوں کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ ساتھ دینے کی غلطی بھی نہیں کرتے۔ یہ شعر ان لوگوں پر ایک طنز ہے جو لوگ صرف اور صرف باتیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد کے اشعار میں شاعر نے ایسے الفاظ اور تراکیب کا استعمال کیا ہے جو کہیں نہ کہیں کربلا کے مناظر کو ظاہر کرتے ہیں۔ ساتویں شعر میں شاعر موجودہ وقت کے ماحول کا موازنہ میدان کربلا کے وقت کے ماحول سے کرتا ہے، شاعر کہتا ہے کس طرح آج بھی وہی منافقت، وہی جھوٹ، وہی مکاری اور دغابازی لوگوں کا شیوہ ہے جو امام حسین کے زمانے میں میدان کربلا میں لوگوں کا شیوہ تھی۔ آیئے اب شاعر کے ایسے اشعار کو موضوع سخن بناتے ہیں جن میں جنگ کے بعد کے حالات، افراتفری اور بربادی کو پیش کیا گیا ہے۔

فضا میں خوف کے پرچم بلند ہوتے ہیں　　سوادِ شام سے لشکر کوئی گزرتا ہے
ہمارا دل کہ تمہارا غرورِ تشنہ لبی!　　تمام تیرِ ستم اک نشانہ چاہتے ہیں

یہ اور طرح کے شکاری ہیں، بس تیرِ ستم کے پجاری ہیں
کچھ دانہ ان کے پاس نہیں، یہ کوئی جال نہیں رکھتے

منافقت کی زمیں پر فریب ہے کتنی　　خدا کرے کہ تم اس تازہ کربلا سے بچو

ان تمام اشعار میں شاعر نے کچھ نہ کچھ ایسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جن کے ذریعے ہمارے ذہن میں کربلا کے واقعات گردش کرنے لگتے ہیں۔ اگر سرسری طور پر اس مضمون کا جائزہ لیں تو یہ پتا چلتا ہے کہ شاعر کے یہ اشعار معرکہ کربلا سے لے کر موجودہ وقت تک کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں مشابہت رکھتے ہیں۔ خواہ بات منافقت کی ہو یا غداری یا لالچ کی، ہر دور میں ایسے لوگ زندہ رہے ہیں اور رہتی دنیا تک ایسے لوگوں کا وجود باقی رہے گا۔ بلاشبہ ہم یہ بات آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ اسعد کے یہ اشعار ہر دور میں ایسے لوگوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے وجود کو باقی رکھیں گے۔



ڈاکٹر قمر حیدر
استاد شعبۂ فارسی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، رابطہ نمبر: 9910786441

امیر خسرؔو کی مثنوی 'قران السعدین' اور ذکرِ دہلی

تلخیص:

امیر خسرو کو معزالدین کیقباد کے حکم سے ملک الشعرائی کا عہدہ ملا۔ کیقباد کی خواہش تھی کہ امیر خسرو، کیقباد اور اس کے والد کی ملاقات اور چپقلش کا مکمل نظمیہ احوال لکھیں۔ امتثال امر میں خسرو نے مثنوی 'قران السعدین' لکھنی شروع کی اور تین ماہ کی مختصر مدت میں اس مثنوی کو مکمل کر دیا۔

انھوں نے موقع اور محل کی مناسبت سے نہایت سلیقہ کے ساتھ فراق و ہجر کے مضامین بھی باندھے ہیں۔ ہندوستان کی یہ پہلی مثنوی ہے جس میں مروجہ اسلوب اور متداول انضباط و قواعد سے ہٹ کر نئے تجربے کیے گئے ہیں۔ مثلاً اس مثنوی میں بعض مقامات پہ امیر خسرو نے غزل کا اضافہ کیا ہے جو صرف انھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔

اس مثنوی کی ایک سب سے ممتاز اور منفرد خصوصیت یہ ہے کہ امیر خسرو نے اس میں دہلی کی مکمل تہذیبی اور تمدنی تاریخ نیز اس شہر کے مختلف موسم، کیفیات، تاریخی مقامات، قلعے اور یہاں کی آب و ہوا کے متعلق اہم معلومات قلم بند کی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ محض شاعرانہ تصرف کا بہترین نمونہ ہی نہیں بلکہ دہلی کی مکمل تہذیبی تاریخ ہے۔ یوں تو دہلی عرصۂ دراز سے صوفیوں اور عرفا کی منظورِ نظر رہی ہے، اور چوں کہ اس شہر میں صوفیوں کے متعدد بڑے مقبرے ہیں لہٰذا اس شہر کو صرف دہلی کہنا بھی خلاف ادب سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ عرفا نے اس شہر کو 'حضرت' کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

کلیدی الفاظ:

امیر خسرو، معزالدین کیقباد، قران السعدین، ہجر و فراق، غزل، دہلی کی تمدنی و تہذیبی تاریخ۔

امیر خسرو دہلوی (۶۵۱......۷۲۵ھ) ہندوستان کے والا استعداد شعرا میں سب سے ممتاز مقام

اور اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ شعرائے دورِ سلطنت میں دارائی سطوت اور جمشیدی شکوہ وشوکت کے مالک تھے۔ ترک نژاد تھے لیکن ہندوستان میں پیدا ہوئے، اور اسی بنا پہ ان کے شعری آثار میں ہندوستان کے دل انگیز اور دلآویز نقوش اور تصاویر نہایت شرح وبسط کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ امیر خسرو محض آٹھ سال کے تھے جب ان کے سر سے شفقت پدری کا سایہ اٹھا۔ اس حادثہ سے وہ بے پناہ متاثر ہوئے۔ وہ ایک مرثیہ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

سیف از سرم برفت و دل من دو نیم شد　　　دریای من روان شد و دُرّ یتیم ماند

وفات پدر کے بعد، ان کے نانا عماد الملک نے اپنی تربیت میں پروان چڑھایا، اور ان کے ایما پر متداول علوم کی تحصیل میں مشغول ہوئے۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں جملہ مروجہ فنون وعلوم میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ البتہ بچپن ہی سے ان کے مزاج میں شاعرانہ رنگ موجود تھا۔ اس ضمن میں وہ خود لکھتے ہیں:

''درآن صغرسن کہ دندان می افتاد، سخن می گفتم وگوہر از دہانم می سفتم۔'' (دیباچہ غرۃالکمال، ص ۶۹)

بیس سال کی عمر میں دوبارہ یتیم ہوگئے۔ ۶۷۱ ہجری میں عماد الملک کی ایک سو تیرہ سال کی عمر میں وفات واقع ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد خسرو کو ایک مستقل سرپرستی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بنابرایں ملک چھجو کی ملازمت میں آ گئے۔ لیکن کچھ ہی مدت میں بغرا خان کی سرپرستی میسر ہوگئی لہٰذا بغرا خان کی ملازمت میں سامانہ چلے گئے۔ ۶۷۶ ہجری میں بغرا خان نے طغرل اور اس کے فتنے کا خاتمہ کر دیا اور بنگال کا حاکم بنا۔ امیر خسرو اس سفر میں بلبن کے لشکر کے ہمراہ تھے۔ فتنۂ جنگ کے سرد پڑتے ہی دہلی لوٹ آئے۔ اس فتح کی خوشی میں ایک یادگار جشن کا اہتمام کیا گیا جس میں امیر خسرو کو شاہزادہ محمد قاآن سے ملاقات کی سعادت ملی۔ وہ امیر خسرو سے اتنا متاثر ہوا کہ انھیں مصحف داری کے عہدہ پہ مامور کر کے اپنے ہمراہ ملتان لے گیا۔ وہاں کی پانچ سالہ اقامت اور شاہزادہ محمد کی حملہ تیموری میں شہادت کے بعد اسیر ہوئے۔ اس وقت کی کیفیت کو خسرو یوں بیان کرتے ہیں:

''درآن کانون بلا مرا نیز در رشتہ کافران گلوگیر کردند اما چون خدای رشتہ عمرم دراز دادہ بود، خلاص یافتم۔'' (مصدر سابق، ص ۷۳)

ان تلخ تجربوں کے بعد امیر خسرو واپس دہلی لوٹ آئے اور حاکم اودھ خان جہان امیر علی سرجاندار کے دربار سے ملحق ہوگئے۔ یہاں تقریباً دو سال مقیم رہے لیکن دہلی کی آب وہوا اور وہاں پہ موجود احباب واقربا کی یاد نے اتنا مضطرب کیا کہ پھر دہلی لوٹ آئے۔ دہلی میں معزالدین کیقباد، اریکہ شاہی پہ متمکن تھا اس کے حکم سے انھیں ملک الشعرائی کا عہدہ ملا۔ کیقباد کی خواہش تھی کہ امیر خسرو، کیقباد اور اس کے والد کی

ملاقات اور چپقلش کا مکمل نظمیہ احوال لکھیں۔ امتثال امر میں خسرو نے مثنوی 'قران السعدین' لکھنی شروع کی اور تین ماہ کی مختصر مدت میں اس مثنوی کو مکمل کر دیا۔

ہندوستان میں تاریخی مثنویوں کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے۔ اس سلسلہ میں عصامی کی تاریخی مثنوی فتوح السلاطین اور آذری اسفرائنی کی بہمن نامہ بہت معروف ہیں۔ امیر خسرو نے کئی اہم اور یادگار مثنویاں لکھی ہیں۔ نظامی گنجوی کے جواب میں خمسہ مشہور ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی مثنویات میں مثنوی مفتاح الفتوح، مثنوی خضر خان دولرانی، مثنوی نہ سپہر، مثنوی تغلق نامہ اور مثنوی قران السعدین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر مثنوی کی اہمیت اور تاریخی انفرادیت کے سبب، بعض محققین نے اسے 'مجمع الاوصاف' اور بعض نے دہلی کے ذکر کی وجہ سے 'مثنوی در تعریف دہلی' قلمداد کیا ہے۔ یہ نام اس وجہ سے مشہور ہوئے کہ مذکورہ مثنوی میں دہلی، اس کا موسم، قصر، کیلوکھیری اور یہاں کی آب وہوا کا بیان نہایت چابک دستی اور فنی مہارت کے ساتھ آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ مثنوی معز الدین کیقباد کے حسب الامر لکھی گئی۔ یہ محض تین ماہ کی قلیل مدت میں مکمل ہوئی۔

جب بلبن کا انتقال ہوا اس وقت اس کا بیٹا ناصر الدین محمود، لکھنوتی میں حاکم تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں خود اسی کا بیٹا کیقباد، دہلی کے تخت پہ قابض ہو جاتا ہے۔ جب محمود کو اپنے بیٹے کی سلطنت آرائی کی خبر ملتی ہے تو حملے کے لیے وہ دار السلطنت روانہ ہوتا ہے۔ بیٹے کو بھی باپ کے ارادوں کا اندازہ ہوتا ہے لہٰذا وہ بھی جوابی کاروائی کے لیے دہلی سے روانہ ہوتا ہے۔ اودھ کے نزدیک سرجو ندی کے کنارے دونوں لشکر کا آمنا سامنا ہوتا ہے لیکن دونوں طرف موجود ہوشمند اور زیرک مدبرین کی حکمت عملی کے سبب جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ سارا معاملہ صلح پہ ختم ہوا اور محمود نے بیٹے کیقباد کو اپنے ہاتھوں دہلی کی سریر سلطنت پہ بٹھایا۔ جب باپ اور بیٹے نے صلح کر لی اور معانقہ بھی کر لیا تو اس مبارک مناسبت سے امیر خسرو نے ایک نہایت زبردست قصیدہ لکھا۔ جس کا مطلع یوں ہے ۔

زہی ملک خوش چون دو سلطان یکی شد زہی عہد خوش چون دو پیمان یکی شد

باپ بیٹے کی مصالحت اور اس درمیان میں پیش آمدہ وقائع وحالات کو امیر خسرو نے نہایت متانت وصلابت فن کے ساتھ منظوم کیا ہے اور مثنوی کا نام 'قران السعدین' (یعنی دو مبارک ستاروں کا ملن) رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ مثنوی، اس عہد کے تہذیبی نشیب وفراز اور تاریخی کوائف کی آئینہ دار ہے۔ شاعر کی کوشش یہ ہے کہ تاریخی واقعات کے انجام میں شاعرانہ خیال پردازی، حقائق اور اصالت واقعہ سے دور نہ کرے بلکہ اصل قضیہ کو باریک نظری کے ساتھ دلچسپ انداز میں پیش کر دیا جائے۔ یہ بھی سچ ہے کہ

امیر خسرو کو جہاں بھی اپنی شاعرانہ تخیل بافی کا موقع ملا ہے وہاں پہ کھل کر مختلف صنائع شعری کا استعمال کیا ہے۔ تغزل کو پورے لوازمات کے ساتھ لفظوں میں اتار دینے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ملاحظہ کریں کہ باپ بیٹے کی ملاقات کو کس قدر متغزلانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

خرم آن لحظہ کہ مشتاق بہ یاری برسد آرزومند نگاری بہ نگاری برسد

انھوں نے موقع اور محل کی مناسبت سے نہایت سلیقہ کے ساتھ فراق و ہجر کے مضامین بھی باندھے ہیں۔ ہندوستان میں یہ پہلی مثنوی ہے جس میں مروجہ اسلوب اور متداول انضباط و قواعد سے ہٹ کر نئے تجربے کیے گئے ہیں۔ مثلاً اس مثنوی میں بعض مقامات پہ امیر خسرو نے غزل کا اضافہ کیا ہے جو صرف انھیں کے ساتھ مخصوص ہے۔

سخت دشوارست تنہا ماندن از دلدار خویش با کہ گویم حال تنہا ماندن دشوار خویش

مثنوی 'قران السعدین' نظم کرنے کے بعد امیر خسرو ملک الشعرائی کے عہدے پہ متعین ہوئے۔ لیکن انھوں نے جن گراں بہا انعامات کی خواہش اور وعدے پہ مذکورہ مثنوی لکھی تھی وہ نہیں میسر آ سکے۔ بہر حال ۳۶ رسال کی عمر میں مکمل یکسوئی کے ساتھ انھوں نے محض تین ماہ کی مختصر مدت میں یہ مثنوی لکھی تھی۔ ماہ رمضان ۶۸۸ ہجری میں یہ مثنوی مکمل ہوئی۔

ہمت مردانہ بستم بہ کار ریختم از خامہ دُر شاہوار
باز نیامد قلمم تا سہ ماہ روز و شب از نقش سفید و سیاہ
در رمضان شد بہ سعادت تمام یافت قران نامۂ سعدین نام
آنچہ بہ تاریخ ز ہجرت گذشت بود سنہ شش صد و ہشتاد وہشت

اس مثنوی کی ایک سب سے ممتاز اور منفرد خصوصیت یہ ہے کہ امیر خسرو نے اس میں دہلی کی مکمل تہذیبی اور تمدنی تاریخ نیز اس شہر کے مختلف موسم، کیفیات، تاریخی مقامات، قلعے اور یہاں کی آب و ہوا کے متعلق اہم معلومات قلم بند کی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ محض شاعرانہ تصرف کا بہترین نمونہ ہی نہیں بلکہ دہلی کی مکمل تہذیبی تاریخ ہے۔ یوں تو دہلی عرصۂ دراز سے صوفیوں اور عرفا کی منظورِ نظر رہی ہے۔ اور چوں کہ اس شہر میں صوفیوں کے متعدد بڑے مقبرے ہیں لہٰذا اس شہر کو صرف دہلی کہنا بھی خلاف ادب سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ عرفا نے اس شہر کو 'حضرت' کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ 'طبقات ناصری' اگر چہ ہندوستان کی سیاسی اور ادبی تاریخ ہے لیکن اس میں بھی دہلی کا ذکر 'حضرت دہلی' کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مثلاً منہاج سراج ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سلطان شمس الدین طاب ثراہ لشکرہای ہندوستان بہ طرف لکھنوتی برد و در شہور سنہ سبع وعشرین و ستہ ماۃ آن طاعی بہ دست آورد و تخت لکھنوتی بہ ملک علاء الدین جانی داد و در رجب ہمین سال بہ حضرت دہلی باز آمد۔'' (طبقات ناصری ص ۴۴۰)

امیر خسرو نے بھی جب بھی دہلی کا ذکر کیا نہایت شیفتگی اور والہانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ بھی 'حضرت دہلی' ہی کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض مقام پہ 'جنت عدن' ہونے کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں۔ ان کے بقول اگر مکہ بھی اس دیار مطہر کی عظمت کے قصے سن لے تو وہ خود یہاں کی زیارت پہ کمربستہ ہوگا۔ مدینہ اس شہر کے سر کی قسم کھاتا ہے۔

حضرت دہلی کہ کنف دین و داد   جنت عدن است کہ آباد باد
ہست چو ذات ارم اندر صفات   حرسہا اللہ عن الحادثات
گر شنود قصۂ این بوستان   مکہ شود زائر ہندوستان
قبۂ اسلام شدہ در جہان   بستۂ او قبۂ ہفت آسمان

یہ شہر صرف اپنے سیاسی انقلابات اور تہذیبی ارتقا کے لحاظ سے ہی قابل توجہ نہیں ہے بلکہ جو سلاطین اور امرا یہاں کے اریکہ سلطنت پہ جلوہ افروز ہوئے انھوں نے اپنی یادگار کے طور پہ تاریخی مقامات کی اساس کاری کی ہے اور اس شہر کو دشمنوں کے دست تطاول سے محفوظ رکھا ہے۔ دہلی کے قلعے محض اپنی خوش نمائی میں ہی بے نظیر نہیں بلکہ استحکام امنیت کے حوالے سے بھی لاثانی ہیں۔ امیر خسرو نے دہلی کے تقریباً تین حصاروں کا ذکر کیا ہے۔

از سہ حصارش دو جہان یک مقام   وز دو جہان یک نفسش دہ سلام
حصن برونیش ز عالم برون   عالم بیرونش بہ حصن اندرون
حصن درونیش تو گوئی مگر   چرخ بہ زیرست و حصارش ببر

یہاں کے مستحکم اور مضبوط قلعوں اور حصاروں کے بعد، اہل دہلی اور یہاں کے خوبان خوش جمال کی خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شہر دہلی میں علم و ہنر کا دور دورہ ہے بلکہ یہاں کا ہر آدمی، علم و فضل میں سب سے آگے اور پیش قدم نظر آتا ہے۔ یہاں کے ہر گوشہ و کنار میں بہشتیں آباد ہیں جو اسے دنیا کے دیگر ترقی پذیر شہروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ انھوں نے دہلی کی مسجد جامع کا بھی تزک و احتشام کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اس کو 'مرکز فیض خدا' شمار کیا ہے۔ اس مسجد میں لوگ ہی عبادت میں مصروف نہیں رہتے بلکہ خود مسجد محو تہلیل اور تقدیس خداوندی ہے جس کی صدائے تکبیر ماہ و ثریا تک پہنچتی ہے۔ اس مسجد میں نو گنبد تھے۔

مسجد او جامع فیض الہ   زمزمہ خطبہ او تا بہ ما

بر سر نہ تخت گرفتہ سہی منبرش از خطبہ بیت اللٰہی
غلغل تسبیح بہ گنبد درون رفتہ ز نہ گنبد والا برون
ہر کہ سعادت بودش رہنمای بر در او سر نہد آن والا پای

اس منظومے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جگہ جگہ اہالیان دہلی کی خوبیوں اور اچھائیوں کا ذکر سمویا گیا ہے۔ یہ خسرو کی دہلی سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔ انھیں دہلی ہی نہیں بلکہ یہاں کی ہر چیز سے عشق تھا۔ اس ذیل میں انھوں نے صرف اپنے رفقا اور احباب کا ذکر نہیں کیا بلکہ بتانِ دہلی کی پر کشش اداؤں کو بھی شرح و بسط کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قلبی واردات کے بیان کے لیے غزل سے بہتر کوئی اور قالب اور ہیئت نہیں ہے لیکن خسرو مقلد محض نہیں تھے بلکہ تجربے کے دلدادہ اور مبتدعانہ ذہن کے مالک تھے، لہٰذا اس تاریخی مثنوی میں نہایت عاشقانہ طرز میں بتان دہلی کی قاتلانہ اداؤں کا یوں ذکر کرتے ہیں۔

ای دہلی و بتان سادہ پگ بستہ و ریشہ کج نہادہ
خون خوردن شان بہ آشکارست اگرچہ پنہان خورند بادہ
فرمان نبرند از آن کہ ہستند از غایت ناز خود مرادہ
نزدیک دل آنچنان کہ جان را برداشتہ گوشہ‌ای نہادہ
جائی کہ برہ کنند گل گشت در کوچہ دمد گل پیادہ
آسیب صبا رسید بر دوش دستار چہ بر زمین فتادہ
شان در رہ و عاشقان بہ دنبال خون ناب ز دیدہ‌ہا کشادہ
ایشان ہمہ باد حسن در سر و این‌ہا ہمہ دل بہ باد دادہ
خورشید پرست شد مسلمان ز ین ہندوگان شوخ و سادہ
کردند مرا خراب و سرمست این مغ بچگان تاک زادہ
بربستہ شان بہ موی مرغول خسرو چو سگیست در قلادہ

امیر خسرو نے مسجد جامع کے بعد اس کے منارۂ بلند کے حوالے سے بھی گفتگو کی ہے۔ درحقیقت یہ منارہ، گلدستہ اذان تھا لیکن مرور ایام کے ساتھ اس کے نقوش مٹ گئے۔ ان کے عہد میں وہ بعینہ ویسا ہی سر بلند تھا جیسا کہ انھوں نے بیان کیا ہے۔ اس مینارے کا بالائی حصہ زر سے بنایا گیا تھا۔ اس چیز کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ حسن تعلیل بیان کی ہے کہ چاند اس کی زیارت کے لیے بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا رہتا ہے اور اسی مینارے کی دل کشی کے سبب پوری رات بیدار رہتا ہے۔

شہر دہلی کی ایک معروف تاریخی یادگار، حوض شمسی تھا جسے ۶۲۷ ہجری میں سلطان شمس الدین التمش کے حکم پہ تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ حوض دو پہاڑوں کے دامن میں واقع تھا۔ پانی نہایت شیریں اور شفاف، خسرو کے مطابق اگر حضرت خضر اس پانی کا ایک چلو بھی پی لیں تو وہ چشمہ حیات کی لذت فراموش کر دیں گے۔ بہر حال پورے شہر کی آبی ضروریات اسی حوض سے پوری ہوتی تھیں۔ اس حوض کا پانی اتنا شفاف تھا کہ رات میں بھی اس کے اندر پڑے ہوئے چھوٹے سنگریزے صاف نظر آتے تھے۔ اس کی طوفان انگیز موجیں، ساحل کوہ پہ سر پٹکتی تھیں۔ اس حوض کے درمیان ایک چھوٹا سا محل بھی تھا۔

در کمر سنگ میان دو کوہ   آب گہر صفوت و دریا شکوہ
تا خضر آب خوش او نوش کرد   آب خوش چشمہ فراموش کرد
در تہ آبش ز صفا ریگ خرد   کور تواند بہ دل شب شمرد

اس کے بعد کے ابیات میں، اس دیار کے گل بوٹے، آب و ہوا، موسم، سردی اور خنکی کا بیان ہے۔ ان کے مطابق اگر کوئی شخص اس دیار کا پانی پی لے تو وہ آب خراسان بھول جائے۔ انھیں یہاں کی گرمی کا بھی خوب اندازہ ہے لہٰذا اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ چوں کہ خراسان کی بہ نسبت آسمان سرد مہری دکھاتا ہے لہٰذا وہاں کا موسم بیشتر سردی کا شکار رہتا ہے لیکن دہلی کی گرمی، مہر فلک کی گرمی محبت کے سبب ہے یہاں ایسے تروتازہ، خوش بودار اور رنگ برنگے پھول اگتے ہیں جو خراسان نے کبھی دیکھے بھی نہ ہوں گے۔

ہر کہ در این ملک دمی آب خورد   گشت دل از آب خراسانش مرد
بسکہ خنک دید خراسان سپہر   گشت ہمہ سال برو سرد مہر
گرچہ در این ملک ہوا ہست گرم   از خنکی ہای خراسان چہ شرم
مہر فلک گرم شد اندر وفاش   گرم از آن گشت جہان را، ہواش

سلطان معز الدین کیقباد نے دریائے جمنا کے کنارے 'کیلوکھیری محل' تعمیر کرایا تھا۔ خسرو نے مذکورہ قصر کی خوب ستائش کی ہے۔ ان کے مطابق یہ قصر گویا ایک بہشت ہے جہاں طوبیٰ کی شاخیں خاکروبی کرتی ہیں۔ یہ اتنا بلند و بالا ہے کہ آفتاب گویا ابر ہے اور چاند اس کی خوب صورتی کے پیش نظر دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے لیکن اس نے اپنی نخوت میں انکار کر دیا۔ اس محل میں استعمال شدہ خشت اتنے شفاف ہیں گویا آئینہ ہیں جس میں صورتیں منعکس ہوتی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے قصر کیلوکھیری میں منعقد ہونے والے جشن نوروزی کی گہما گہمی اور اس کے مختلف زر و جواہرات سے سجاوٹ، آرائش اور زیبائش کا قدرے مفصل ذکر کیا ہے۔

قصر ہمایون ز زمین تا سماک   زیور زر بستہ چو فردوس پاک

شاہ جہان نشستہ بہ زرین سریر　　　چشم جہان دوختہ از قد چو تیر
تاج بہ سر کردہ چہ گویم چہ تاج　　　قیمت او ہر دو جہان را خراج

اس مثنوی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر خسرو نے مذکورہ مثنوی میں دیگر مثنویوں کی نسبت زیادہ واضح انداز میں ہندوستانی تہذیب وتمدن کا ذکر کیا ہے۔ چوں کہ ابتدائی عمر میں امیر خسرو نے کئی سال دہلی سے باہر مختلف اموراور مناصب کی ذمہ داری میں بسر کیے تھے۔ حتیٰ کہ ملتان کے عہد قیام میں قیدی بھی بنائے گئے، ایسی صورتوں میں انسان کو اپنے وطن کی یاد خوب ستاتی ہے۔ امیر خسرو کو بھی ان واقعات نے دہلی کا شیفتہ بنادیا تھا۔ لہٰذا وہ جب بھی اپنے دیار کا ذکر کرتے ہیں، نہایت عمدگی اور بشاشت کے ساتھ کرتے ہیں۔

☆☆☆

منابع و مآخذ:

۱۔ دیباچہ غرۃ الکمال، مطبع قیصری، دہلی، سنہ ندارد (فارسی)
۲۔ مفتاح الفتوح، بہ تصحیح: عبدالرشید، دانش گاہ اسلامی علی گرہ، ۱۹۵۴ء (فارسی)
۳۔ مثنوی دولرانی خضر خان، بہ تصحیح و تحقیق: مولانا رشید احمد سالم انصاری، مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ، ۱۹۱۷ء (فارسی)
۴۔ امیر خسرو، تالیف و تحقیق: ڈاکٹر وحید میرزا، نیشنل امیر خسرو سوسائٹی، نئی دہلی، ۱۹۱۷ء
۵۔ مثنوی تغلق نامہ، خسرو دہلوی، بہ تصحیح: سید ہاشمی فرید آبادی، مطبع اردو، دکن، ۱۹۳۳ء
۶۔ مثنوی قران السعدین، بہ تصحیح: مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، سنہ ندارد
۷۔ طبقات ناصری، منہاج الدین عثمان، بنیاد فرہنگی جہانداران غوری، کابل، ۱۹۳۱ش

☆☆☆

ڈاکٹر ناہید زہرا
شعبۂ فارسی، ملّت کالج، دربھنگہ، رابطہ نمبر: 9027231233

ہرگوپال تفتہؔ اور ان کی مرثیہ گوئی

تلخیص:
مرثیہ عربی سے فارسی میں آیا ہے مگر فارسی میں اس کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ فارسی کے اولین مشہور شاعر فردوسیؔ کے شاہنامہ میں چند اشعار حزن و ملال اور گریہ و زاری کے ملتے ہیں۔ جس میں سہراب کی موت پر اس کی ماں گریہ کرتی ہے لیکن اس کو رزمیہ نظم میں شامل کرلیا گیا۔ اس کے بعد فرخی نے سلطان محمود کی وفات پر پر درد مرثیہ رقم کیا ہے۔ فرخیؔ کے بعد سعدیؔ کا مرثیہ ہے جو انھوں نے عباسی خلافت کے زوال پر لکھا ہے۔
فارسی شاعری میں مرثیہ کو عروج عہد صفوی میں ملا۔ اس دور میں شعرا نے مرثیہ گوئی کی طرف توجہ دی۔ اس دور کے شعرا نے واقعۂ کربلا اور امام حسین اور ان کے رفقا کی شہادت پر مرثیے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ شخصی مرثیہ بھی لکھے ہیں۔ عہد صفوی کے مشہور مرثیہ نگاروں میں محتشم کاشانی اور مقبل وغیرہ ہیں۔ سب سے زیادہ مقبولیت محتشم کاشانی کے دوازدہ بند کو ملی ہے۔ اس کے بعد دیگر شعرا نے بھی محتشم کی تقلید میں مرثیہ کہے ہیں۔ فارسی مرثیہ گویوں میں منشی ہرگوپال تفتہؔ کا نام بھی آتا ہے۔ میرزا تفتہؔ نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہزارہا اشعار قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے فارسی میں دو شخصی مرثیے لکھے ہیں، ایک اپنے چھوٹے بیٹے کی وفات پر اور دوسرا اپنے عزیز دوست بانکی لال رندؔ کی وفات پر قلم بند کیا ہے۔

کلیدی الفاظ:
مرثیہ، فارسی میں مرثیہ گوئی، فردوسی، فرخی، سعدی، محتشم کاشانی، منشی ہرگوپال تفتہؔ، دو شخصی مرثیے۔

فارسی زبان میں شعرا نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ فارسی شاعری کا آغاز قصیدہ گوئی

سے ہوتا ہے، بڑے بڑے شعرا نے بادشاہوں کی شان میں قصیدے کہے ہیں۔ پھر غزل کا دور آتا ہے اور شعرا کے دیوان غزل سے بھر جاتے ہیں۔ غرض کہ رباعی، قطعات ترجیع بند سب میں فارسی شعرا نے کلام کہا ہے مگر مرثیہ ایک ایسی صنف ہے جس میں فارسی میں کم توجہ دی گئی۔ مرثیہ عربی سے فارسی میں آیا ہے مگر فارسی میں اس کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ فارسی کے اولین مشہور شاعر فردوسیؔ کے شاہنامہ میں چند اشعار حزن و ملال اور گریہ وزاری کے ملتے ہیں۔ جس میں سہراب کی موت پر اس کی ماں گریہ کرتی ہے لیکن اس کو رزمیہ نظم میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے بعد فرخی نے سلطان محمود کی وفات پر پر درد مرثیہ رقم کیا ہے۔ فرخی کے بعد سعدیؔ کا مرثیہ ہے جو انھوں نے عباسی خلافت کے زوال پر لکھا ہے۔ جس کا مطلع یوں ہے ؎

آسمان را حق بود گر خون ببارد بر زمین　　بر زوال ملک مستعصم امیرالمومنین

فارسی شاعری میں مرثیہ کو عروج عہد صفوی میں ملا۔ اس دور میں شعرا نے مرثیہ گوئی کی طرف توجہ دی۔ اس دور کے شعرا نے واقعۂ کربلا اور امام حسین اور ان کے رفقا کی شہادت پر مرثیے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ شخصی مرثیہ بھی لکھے ہیں۔ عہد صفوی کے مشہور مرثیہ نگاروں میں محتشم کاشانی اور مقبل وغیرہ ہیں۔ سب سے زیادہ مقبولیت محتشم کاشانی کے دوازدہ بند کو ملی ہے۔ اس کے بعد دیگر شعرا نے بھی محتشم کی تقلید میں مرثیہ کہے ہیں۔ فارسی مرثیہ گویوں میں منشی ہرگوپال تفتہؔ کا نام بھی آتا ہے۔ میرزا تفتہؔ نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہزارہا اشعار قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے فارسی میں دو شخصی مرثیے لکھے ہیں، ایک اپنے چھوٹے بیٹے کی وفات پر اور دوسرا اپنے عزیز دوست بانکی لال رندؔ کی وفات پر قلم بند کیا ہے۔

تفتہ غالب کے تلامذۂ ارشد اور غالب کے پسندیدہ اور چہیتے شاگرد تھے۔ لیکن زمانہ نے ان کی کوئی قدر نہیں کی۔ فارسی کا بہترین شاعر صرف اور صرف غالب کے خطوط کے حوالے سے جانا جا رہا ہے، نہ کہ ان کی فارسی دانی کی وجہ سے۔ بقول ضیاء الدین انصاری ''تفتہ ان کم نصیب شعرا میں ہیں جس کی طرف ہمارے محققین، ناقدین اور تذکرہ نگاروں کی نگاہ التفات کم ہوئی۔ وہ اپنے عہد میں بھی کم التفاتی کا شکار رہے۔''[۱]

یہ عین حقیقت ہے کہ تفتہ کے حال و احوال کے متعلق مزید معلومات فراہم نہیں ہوتی ہیں جب کہ مرزا تفتہ یگانہ روزگار، مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ اس کے باوجود ان کے متعلق مزید اطلاعات نہیں ملتیں۔ غرض کہ جو کچھ حالات زندگی کے بارے میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ تفتہ سکندر آباد (اتر پردیش) کے ایک کایستھ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد کا نام موتی لال تھا۔ تفتہ کا سن پیدائش مولف 'تفتہ، غالب اور تلامذۂ غالب' نے ۱۲۱۴ھ رقم کیا ہے۔ جب کہ عراق رضا زیدی نے اپنے مقالے میں ۱۲۱۵ھ رقم کیا ہے اور اس کی دلیل میں انھوں نے تفتہ کے قطعات پیش کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں ؎

شد سال ولادتم چون مذکور　پیش یک مرد معانی آرا
او یافت 'ہنر سرشت' تاریخ　گفتم من بی ہنر دریغا[۲]
(۱۲۱۵ء)

اس کے علاوہ دوسرا قطعہ ہے ؎

ای کہ گوئی سال میلادی ترا　تفتہ بی جستیم درہم آمدیم
بعد یک رفتن حساب آید درست　بہر رفتن ما بعالم آمدیم

مذکورہ بالا قطعات سے ان کی تاریخ ولادت ۱۲۱۵ھ نکلتی ہے۔ ان کا پورا نام منشی ہر گو پال بھٹنا گر تفتہ سکندر آبادی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھٹنا گر کایستھ ہیں۔ ان کے اجداد سکندر لودی کے عہد میں سکندر آباد میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ حکومت کی جانب سے قانون گوئی کے عہدہ پر فائز ہوئے اور ساتھ میں بہت سی زمین اور جاگیر بھی ملی۔ بعد میں یہ عہدہ نسل در نسل ان کے خاندان میں چلتا رہا۔ تفتہ بھی ایک مدّت تک اس عہدہ پر فائز رہے اور اپنے پسندیدہ شغل شاعری کو بھی انجام دیتے رہے۔

تفتہ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد کے زیر سایہ گھر میں ہوئی۔ یہیں سے ان کے اندر فارسی کا شوق پیدا ہوا۔ خداداد صلاحیتوں اور خود کے شوق کی بنا پر فارسی زبان میں مہارت حاصل کی اور شعر و سخن کے آسمان میں ایک روشن ستارے کے مانند اپنی جگہ بنائی۔ یہ الگ بات ہے کہ زمانے نے ان کو وہ توجہ نہیں دی جس کے وہ حق دار تھے۔ تفتہ نے اپنی زندگی میں ذریعۂ معاش کے لیے مختلف ملازمت کی، سکندر آباد کی ملازمت ترک کر کے وہ مراد آباد چلے گئے اور جب وہاں دل نہ لگا تو وہ ملازمت ترک کر کے انگریزی حکومت میں ملازم ہو گئے۔ مدّتوں انگریزی محکمۂ بندوبست میں قانون گوئی کے عہدہ پر فائز رہے۔ مگر جناب مالک رام کے مطابق شعر و شاعری کے شوق میں نوکری کو خیر باد کہہ دیا اور ۱۸۵۰ء میں ریاست جے پور میں ملازمت کرنے لگے لیکن کچھ عرصہ بعد وہاں سے بھی واپس ہو گئے۔

تفتہ نوکری کے دباؤ میں زندگی نہیں گزارنا چاہتے تھے۔ وہ ایک آزاد زندگی گزرنا چاہتے اور اپنے پسندیدہ شغل (یعنی شعر و شاعری) کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا شعر و سخن کے لیے انھوں نے اپنی ملازمت کی بھی فکر نہیں کی۔ الغرض ان کی معاشی زندگی جیسی بھی ہو ان کی خانگی زندگی بہت اچھی اور پُرسکون تھی۔ ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑے بیٹے کا نام امراؤ سنگھ اور دوسرے کا پیتمبر سنگھ تھا۔ تفتہ کی زندگی میں ان کے بیٹے پیتمبر سنگھ اور بیٹی کی وفات ہو چکی تھی۔ تفتہ کو اپنے بیٹے کا بڑا ہی غم تھا۔ اس کی وفات کے بعد انھوں نے بیٹے کی یاد میں ایک مرثیہ 'تضمین گلستان' کے عنوان سے نظم کیا جس میں انھوں نے اپنے رنج

وغم کا اظہار کیا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ 'تضمین گلستان' کے مندرجہ ذیل ہیں۔

ز فرزندانم آن فرزند کوچک — کہ پیتمبر ہمی خواندش او ہر یک
چہ پیتمبر در امر خیر ساعی — چہارم مصرعی بود از رباعی
چہ پیتمبر عزیز مصر جانہا — زلیخائے متاعش کاروانہا
چہ پیتمبر چراغ خانہ من — دلِ من جانِ من، جانانۂ من
بگریم در سخن فزایم آبی — نویسم بعد ازان نادر کتابی
شود تا زندہ پیتمبر دگر بار — دہد داد میسحائیم ہربار

تفتہؔ کا عہد فارسی کے زوال کا عہد تھا، باوجود اس کے تفتہ نے فارسی کو اپنے فکروفن کے اظہار کی زبان بنایا۔ اس وقت جب کہ ان کے استاد خود اردو میں شعر کہہ رہے تھے۔ تفتہ نے فارسی زبان کو نہیں چھوڑا اور ساری زندگی فارسی میں ہی لکھتے رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اردو میں صرف ایک قطعہ اپنے استاد اسداللہ خاں غالبؔ کی وفات پر نظم کیا ہے۔ قطعہ حسب ذیل ہے۔

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے — ہم سے ہزار ہیچ مداں نامور ہوئے
فیض و کمال صدق و صفا اور حسن و عشق — چھ لفظ اس کے مرنے سے بے پاوسر ہوئے

غرض کہ مرزا ہرگوپال تفتہؔ نے تقریباً ۸۲ ر سال کی عمر میں ۲ ر ستمبر ۱۸۷۹ء (۱۰ ر رمضان ۱۲۹۶ھ) میں اس دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔ بدری کرشن فروغؔ نے ان کی تاریخ وفات کہی ہے۔

ستمبر ستمہا بعالم گذاشت — کہ از دہر سوئے جنان تفتہ رفت
دوم روز در دہر ماتم دوچند — ز جور فلک الاماں تفتہ رفت
(۱۸۷۹ء)

تفتہؔ ایک قادرالکلام اور زودگو شاعر تھے۔ وہ بہت زیادہ شعر کہتے تھے۔ اس کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں یوں کیا ہے:

''میرزا تفتہؔ پیر شود بیاموز۔ تم خوش گو اور زودگو مقرر ہو لیکن جس کو تم تحقیقات کہتے ہو وہ محض توہمات اور تخیلات ہیں۔ قیاس دوڑاتے ہو وہ قیاس کہیں مطابق ہوتا ہے کہیں خلاف۔'' [۳]

غالبؔ کے مذکورہ قول سے صاف ظاہر ہے کہ تفتہؔ ایک زودگو شاعر تھے اور فارسی زبان پر مہارت کامل رکھتے تھے۔ ساتھ ہی غالبؔ نے ان کی تعریف بھی کی ہے کہ وہ خوش گو شاعر ہیں۔ غالب جیسا بلند پایہ شاعر جس کی شاعری کی ستائش کرے تو اس کے لیے یہ سند ہے۔ چوں کہ تفتہؔ بسیار نویس شاعر تھے لہٰذا

انھوں نے فارسی میں چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں اور 'تلامذہ غالب' میں مالک رام لکھتے ہیں کہ ہر دیوان میں بارہ تیرہ ہزار اشعار شامل ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی عمر میں تقریباً ۵۰ ر ہزار اشعار قلم بند کیے اور ہر صنفِ شعر میں طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً غزل، رباعی، قطعات، ترکیب بند، مرثیہ وغیرہ۔ دیوان کے علاوہ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹے کی وفات پر ایک نظم 'تضمین گلستان' کے عنوان سے کہی۔ اور ایک مثنوی 'سنبلستان بوستان' کے جواب میں لکھی ہے۔ میرزا تفتہ فارسی شاعری کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے تمام متقدمین شعرا کی پیروی کی ہے اور ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ سعدیؔ، حافظؔ، ظہوریؔ، نظیریؔ، جلال اسیرؔ، وغیرہ کی تقلید کی ہے۔

جیسا کہ عرض ہو چکا ہے کہ فارسی شاعری میں تمام اصناف میں تفتہ نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے دیوان میں غزلیات، رباعیات، قطعات اور مرثیہ بھی شامل ہیں۔ میرزا تفتہؔ نے دو مرثیے لکھے ہیں ایک اپنے بیٹے پیتمبر سنگھ کی وفات پر اور دوسرا اپنے دوست کی موت پر۔ تفتہؔ اپنے چھوٹے بیٹے سے بہت محبت کرتے تھے اور اس کے کم سنی میں گزر جانے پر بہت مغموم ہوئے اور اسی رنج و غم حزن و ملال کی کیفیت میں انھوں نے پردرد اور دلخراش مرثیہ لکھا۔ میرزا تفتہؔ کے حالات زندگی سے یہ تو معلوم نہیں ہوا کہ ان کے بیٹے کی کس عمر میں وفات ہوئی۔ اگرچہ مرثیہ میں ایک شعر ملتا ہے جس میں انھوں نے ۱۲ ر سال رقم کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

طفل دہ و دو سالہ طفلی کہ تن زنم گوئی سفینہ‌ام بکنار امان شکست

مذکورہ شعر کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے ان کے بیٹے کی عمر ۱۲ ر سال تھی جب اس نے دار فانی کو خیرباد کہا۔ بیٹے کی تاریخ وفات کے سلسلہ میں تفتہ نے مرثیہ کے آخری بند کے آخری شعر میں ۱۲۷۲ھ رقم کیا ہے ؎

تاریخ کس مپرس کہ در خودنیم کنون پیتمبر آہ شد ز جہاں چون زنیم کنون

(۱۲۷۲ھ)

عزیز بیٹے کی وفات کے وقت تفتہؔ کی عمر بھی غالباً ۷۵ ر سال رہی ہوگی۔ اس عمر میں جوان بیٹے کے غم نے ان کی کمر توڑ دی۔ تفتہ نے مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے۔ اس میں ہر بند میں ۲۲ ر سے ۲۴ ر اشعار کا ایک بند رقم کیا ہے۔ کل ۱۴ ر بند قلم بند کیے اور مکمل مرثیہ میں ۳۲۲ ر اشعار ہیں۔ مالک رام نے مرثیہ کے اشعار ۲۲۲ ر رقم کیے ہیں لیکن راقمہ کو تفتہؔ کا جو دیوان دستیاب ہوا ہے، اس میں پیتمبر سنگھ کے مرثیہ میں ۳۲۲ ر اشعار ہیں۔

مرثیہ کے تمہیدی بند میں شاعر اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ بہت غمگین ہے اور مختلف الفاظ و معانی اور ترکیبات سے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کوئی بہت بڑا غم وہ محسوس کر رہے ہیں جس طرح سے تفتہ

نے اپنے اندرونی جذبات کو بیان کیا ہے وہ قابل ذکر ہے۔ان کے بین سے دل ہل جاتا ہے۔شخصی مرثیہ اکثر اتنے دل سوز نہیں ہوئے ہیں مگر تفتہ نے مرثیہ میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔مرثیہ کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

خواہم دگر ز خود بت ظلمت بر آمدن ما چشم خونفشان بصفِ محشر آمدن
خواہم دگر ز مرگ تمنا بفرطِ ضعف بر دوش بیکسی بدرِ داور آمدن
خواہم دگر فغان بلب و خاک رہ بسر از ہر چہ شد نصیب بگفتن در آمدن

اور مکمل بند میں اس طرح اپنے ختم نہ ہونے والے غم واندوہ کو بیان کرتے ہیں اور آخر میں اس شعر پر اپنے جذبات کو اس طرح بیان کرتے ہیں اور اپنے بیٹے کا نام بھی بتاتے ہیں۔

خواہم دگر باانجمن ماتم پسر باصد ہزار درد و بچشم تر آمدن
نام چنان پسر کہ تو دانی مفاخرش پیتمبر است اول و سنگ است آخرش

الفاظ و انداز بیان سب منفرد ہیں۔مرثیہ کا مطلب ہی رونے اور رلانے کا ہے۔تفتہؔ نے بیٹے کے مرثیہ میں جو بین کیے ہیں وہ اکثر مرنے والے اپنے رشتہ دار کے مرنے کے بعد کرتے ہیں اس کو بڑے دل سوز انداز میں بیان کیا ہے۔انھوں نے مرثیہ میں جذبات نگاری سے بخوبی کام لیا اور فطرت کا خیال رکھا ہے یعنی جتنے بھی خونی رشتے تھے سب کا واسطہ دیا ہے،تم نے بہن، بھائی، باپ کے بارے میں نہیں سوچا اور اس دنیا سے چلے گئے۔شعر ملاحظہ ہو۔

پیتمبرانکہ رفت و نجواہر نظر نکرد رحمی بخستہ جانی مسکین پدر نکرد
پیتمبرانکہ قافلہ‌اش را سپہر زد در نیمہ رہ دلی بہ برادر خبر نکرد

مرزا تفتہ نے جس طرح دلخراش بین کیے ہیں اور جذبات نگاری کا مظاہرہ کیا ہے وہ بے مثل ہے۔ ایسا لگتا ہے درد کا سمندر اچھالے مار رہا ہے۔بیٹے کی یاد میں اس قدر غرق ہیں کہ ہر جگہ ہر چیز میں اس کی یاد تلاش کرتے ہیں۔ایک مکمل بند انھوں نے اس کی یادوں کو پیش نظر رکھ کر نظم کیا ہے۔چنانچہ کہتے ہیں۔

رفتی وپیشم از تو دوات و قلم ہنوز غمنامہ‌ہا رواست بملک عدم ہنوز
چیزیکہ ہست در نظرم از تو جانگزاست و ز دیدنش بمن چقدرہا ستم ہنوز
چوبی کمان کہ بود بدست تو وقت لہو بوداست و تیر می‌فلکند بر دلم ہنوز
آن شانہ کز تو پیش من سینہ چاک ماند یادم دہد ز زلف تو ہر پیچ و خم ہنوز
آئینہ‌ای کہ ہر سحرت بود رو برو بنمایدم ز روی ستم روی غم ہنوز

رفتی و چون تصور سیر چمن کنم دانم کہ با منی تو قدم بر قدم ہنوز

اور اس بند کے آخری شعر میں اس طرح سے اپنے تمام تر جذبات و احساسات کو بیان کرتے ہیں کہ بیٹے تم کیا اس دنیا سے گئے ہماری زندگی کی تمام تر لذت اپنے ساتھ لے گئے۔ اب زندگی میں کوئی لطف باقی نہیں رہا۔ لوگ ہماری مصیبت اور پریشانی پر گریہ کرتے ہیں۔ تفتہ نے مرثیہ میں نہ صرف غم و رنج اور تکلیف بیان کی ہے بلکہ انھوں نے مرثیہ میں ادبی پہلو کو بھی قائم رکھا ہے، اور تمام محاسن شعر کا بھی خیال کیا ہے۔ انھوں نے مرثیہ میں تشبیہات و استعارات اور ترکیبات کا استعمال خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ اس سے ان کے کلام کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ بطور مثال یہ شعر ملاحظہ ہو۔

بلبل فغان کشید کہ ہم نغمہ ام نماند گل پیرہن درید کہ گل پیرہن چہ شد

اس شعر میں شاعر نے بیٹے کے لیے گل پیرہن کا استعارہ استعمال کیا ہے اور اس میں صنعت تجنیس سے بھی کام لیا ہے یعنی بلبل فریاد کر رہی ہے کہ میرے ساتھ گیت گانے والا نہیں رہا اور پھول اپنے لباس تار تار کر رہے ہیں کہ گل پیراہن نہیں رہا۔ اس شعر سے تفتہ کی شاعرانہ استعداد کی دلیل ملتی ہے اور اس طرح کے بے شمار اشعار تفتہ کے مرثیہ میں موجود ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

روئی کہ بود رشک مہ چاردہ کجاست زلفی کہ بود غیرت مشک ختن چہ شد
باز آن زمان رسید کہ گل گریہ ام کنند دامان آسمان و زمین لالہ گون شود
واحسرتا کہ جام حیاتش کسی نداد صد رہ لب فسوس بدندان گزیدہ رفت
آہ این شب وفتادن نعشش چنین بخاک شمع است اشکبار بروزم مگر نشست

انسان پر مصیبت و پریشانی کا سبب آسمان ہے۔ فلک کی انسان کے ساتھ جنگ ہے، وہ کبھی آرام سے رہنے نہیں دے گا، تفتہ کے اشعار میں بھی فلک سے شکوہ جا بجا نظر آتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ دنیا نے اس بلا میں مبتلا کیا ہے کہ اب صبر باقی نہیں رہا اور آسمان نے ایسا ستم کیا ہے کہ اب ہوش باقی نہیں۔ آسمان کی کینہ توزی کی وجہ سے ہماری زندگی کا سب لطف ختم ہو گیا ہے۔ تفتہ نے پیتمبر سنگھ کے مرثیہ میں اپنے تمام تر جذبات ادا کیے ہیں اور آخر میں اس کا سال وفات بھی رقم کیا ہے۔

تاریخ کس مپرس کہ در خونیم کنون پیتمبر آہ شد ز جہاں چون زنیم کنون
(۱۲۷۲ھ)

دوسرا مرثیہ اپنے عزیز دوست بانکی لال رند کا نظم کیا ہے۔ وہ راجا بھرت پور کے وکیل تھے۔ یہ مرثیہ بھی ترکیب بند میں نظم کیا ہے ۱۲ / بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند میں ۲۱ / سے ۲۲ / اشعار ہیں اور کل

۲۷ اشعار شامل ہیں۔ وہ مرثیہ کا آغاز دل کش تمہید کے ساتھ کرتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

من شنیدم ہرانچہ کس نشنید بر شنیدن دگر کہ تیغ کشید
نالہ‌ای بود بر لبم کہ چکید من نہ قاصد شناسم و نہ پیام
رنگ از روی انبساط پرید زان چکیدن دگر شگفت چہ گل
دجلۂ خون ز دیدہ چون بارید کس چہ داند کہ دل چرا خون گشت
ناگہان جرعۂ ممات چشید ناگہان ساقی اجل را یافت
متخلص بہ رندؔ بانکی لال باعث فخر ہند بانکی لال

تفتہ نے بیٹے کے مرثیہ میں جس طرح دل خراش بین کیے اور اپنے رنج وغم کا اظہار کیا ہے وہ دوست کے مرثیہ میں کم یاب ہے۔ اس مرثیہ میں انھوں نے رند کے حال احوال اور ان کی سخن دانی کا چرچا کیا ہے۔ ان کے آداب واخلاق وکردار کو بیان کرتے ہیں۔

در چمن بلبل غزل خواں را باید امروز خواند مرثیہ خواں
مشفقم بود مہربانم بود لطف می کرد و مرحمت می کرد
اینک او حاضر است حاتم بود رفت عہدی کہ گفتمی بہوس
پیش او مدحت خودش ذم بود خواندم اکثر قصاید شعرا
ہای پیشم تہ زمین باشد آنچنانی کہ وصفش این باشد

تفتہؔ مرثیہ میں دوست کے خصائص بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ مہربان اور رحم کرنے والا مشفق دوست اور سخی تھا۔ اس کے اندر خضوع وخشوع تھا، وہ خود کی تعریف پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی دیگر صفات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

خوی نیکوی و روی زیبا داشت باطن آئینہ دار ظاہر او
جمع چیزی نہ بہر فردا داشت ہرچہ می یافت می فشاند امروز
باز می گشت و دل ہمانجا داشت ہر کہ در بزم دلکشش می رفت

تفتہؔ کہتے ہیں کہ اگر چہ وہ ہندو تھا لیکن اس کا دل اسلام کی طرف مائل تھا۔

گرچہ گفتی ندارم اما داشت بود ہندو و دل سوی اسلام

تفتہؔ اس کی سخن رانی اور شاعری کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ۔

آنکہ در ہر سخن سخن‌ہا داشت یک غزل بہ ز صد غزل می گفت

خوانده‌ام فیضی و ابوالفضلش بلکہ دستی بہ شعر و انشا داشت

مرثیہ کے آخری بند میں افسوس کرتے ہیں کہ اس دنیا سے ایک ہنرمند چلا گیا اور یہ سب ستم آسمان نے ہم پر ڈھایا۔ اگر زندگی کے بعد کبھی اس سے ملاقات ہوئی تو وہ ہمارے لیے صبح ہوگی۔

تیر باران ز چرخ فتنہ گر است خونچکان دل فزون تر از جگر است
خود ہنر مردنی ہنرمندی گوئی امروز ماتم ہنر است
بعد عمری اگر بود شب وصل تا برویش نظر کنم سحرست
تفتہ قربان اشک خود یعنی چہ تماشاست این کہ در نظرست

اور آخر میں ان کی تاریخ وفات نظم کرتے ہیں۔

تاچہ سالش من و نہان زخمی مردن رندؔ زد بجان زخمی
(۱۲۷۰ھ)

تفتہؔ کا جو دیوان راقمہ کو دستیاب ہوا ہے وہ مطبع کوہ نور لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اس میں صرف دو ہی مرثیہ ہیں اور دیگر وسائل سے بھی یہی معلومات فراہم ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں صرف دو مرثیے لکھے ہیں۔ مرزا تفتہ کا بیٹے کی یاد میں لکھا ہوا مرثیہ زیادہ پر درد ہے۔ جب کہ دوست کی وفات پر لکھے گئے مرثیہ میں غم واندوہ کی کمی نظر آتی ہے۔ مختصر یہ کہ تفتہؔ نے دیگر شعرا کی مانند عہد صفوی کے نامور شاعر محتشم کاشانی کی پیروی کی ہے اور ترکیب بند میں مرثیہ نظم کیا ہے۔ باوجود اس پیروی کے وہ اپنا ایک خاص انداز اور طرز رکھتے ہیں۔ انھوں نے مرثیہ میں اپنے افکار و جذبات واحساسات کو بڑی جدت اور فصاحت کے ساتھ ادا کیا ہے۔ تشبیہات، استعارات کا برمحل استعمال کیا ہے۔ مرثیہ کا اہم جزوہ ابیات ہوتے ہیں جن میں مرنے والے کے متعلق درد وغم، سوز وگداز اور حزن وملال کا بیان کیا جاتا ہے۔ تفتہؔ کے مرثیہ میں یہ خوبی بھی نظر آتی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ تفتہ وغالب، ضیاء الدین انصاری، ص۹
۲۔ ہرگوپال تفتہ، مقالہ: عراق رضا زیدی، ص ۱۱۲
۳۔ غالب فن، تنقید، اخلاق حسین عارف، ص ۵۳

☆☆☆

ڈاکٹر عشرت صبوحی
شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ، رابطہ نمبر:7091175140

میرؔ کی سحر البیانی

تلخیص:
میر تقی میرؔ کی شاعری اردو ادب میں بے مثل ہے۔ ان کا عہد سیاسی وسماجی انتشار کا تھا، جس کا عکس ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں سادگی، ندرت، تاثیر اور گہرائی پیدا کی۔ ان کی شاعری میں زبان کی صفائی کے باوجود ہندی الفاظ واستعارے برقرار ہیں، جو ان کی ہندوستانیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری سادگی اور تاثیر کا حسین امتزاج ہے، جس میں سہل ممتنع کا اعلیٰ نمونہ نظر آتا ہے۔ انھوں نے عام بول چال کی زبان کو شاعری میں برتا، جو ان کے اشعار کو زیادہ دل نشیں بناتی ہے۔
ان کے کلام میں طنز بھی ملتا ہے جو نرم، مگر کاری ہے۔ تشبیہات اور استعارات کم، مگر موثر ہیں، جو گہرا ایمائی اثر رکھتے ہیں۔ پیکر تراشی میں بھی مہارت رکھتے ہیں، جس سے ان کے اشعار تصویری کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اشعار میں نغمگی اور موسیقیت نمایاں ہے، جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ میرؔ کی شاعری خلوص اور سوز وگداز کا بہترین نمونہ ہے، جو ہر دور میں دلوں کو چھوتی رہے گی۔

کلیدی الفاظ:
میر تقی میرؔ، سادگی، تاثیر، ندرت، سہل ممتنع، ہندوستانیت، عام بول چال، پیکر تراشی، نغمگی، موسیقیت، خلوص، سوز وگداز، تشبیہات، استعارات۔

اردو میں ایک سے بڑھ کر ایک شاعر پیدا ہوئے لیکن کسی کو میرؔ کا انداز نصیب نہیں ہوا، اور سارے ہندوستان میں کوئی ایسا شاعر پیدا نہیں ہوا جس کو پیرو میر کہا جائے۔ شادؔ لکھنوی اپنے نام کے ساتھ بڑے فخر سے پیرو میر لکھا کرتے تھے مگر بقول علامہ جمیلؔ مظہری: ’’ان کا ایک شعر بھی میر کے رنگ کا زبان زد خلائق نہ ہوسکا۔‘‘

میر تقی میر نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور جن حالات میں پروان چڑھے وہ ہندوستان کا پرآشوب دور تھا۔ دہلی کے نقوش مٹ رہے تھے۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ قدیم تہذیب وثقافت کے نشانات مٹ رہے تھے۔ میرؔ حساس دل کے آدمی تھے جو کچھ انھوں نے آنکھوں سے دیکھا اور دلوں سے محسوس کیا اس کو انھوں نے اپنی شاعری میں ڈال دیا۔ اسی لیے تو کہا ہے انھوں نے ۔

ہم کو شاعر نہ کہو میر کے صاحب ہم نے　　درد و غم جمع کیے کتنے تو دیوان کیا

میر کی شاعری کی ابتدا اس وقت ہوئی جب کہ اردو گھٹنوں چل رہی تھی۔ شاعری میں نئے تجربات کیے جا رہے تھے۔ نئی نئی ترکیبیں اور بندشیں اختراع کی جا رہی تھیں۔ دکنی شعرانے اردو کے دامن کو گلہائے رنگ رنگ سے معمور کر دیا تھا۔ میر نے اپنی شاعری کا قصر اس بنیاد پر قائم کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میر نے اصلاح زبان اور اصلاح شاعری کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس قسم کی رائے تاریخی حقیقت کے بالکل خلاف ہوگی۔ میر نے زبان اور شاعری کی اصلاح میں نمایاں حصہ لیا۔ اور اس' لچر سی' زبان کو دوعدن بنا دیا۔ لیکن انھوں نے زبان کی صفائی کے شوق میں ناسخؔ کی طرح ہندوستان سے بالکل قطع تعلق نہیں کیا۔ ان کے کلام کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے ہندی الفاظ، ہندی استعارات اور تشبیہات کو پوری طرح قائم رکھا جو اس کے مزاج سے ہم آہنگ تھیں اور وہ چیزیں جو اس ارتقائی دور میں کھپ نہیں سکتی تھیں ان کو خارج کر دیا۔ میر کی شاعری یا میر کی شخصیت کوئی منجمد اکائی نہیں ہے۔ وہ ارتقا کی زنجیر کی ا یک کڑی ہے۔ اگر ہم میر کے ادبی کارناموں کو اس روشنی میں دیکھیں گے تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ میر نے زبان کی بڑی خدمت انجام دی اور اس کی جڑوں کو ہندوستان اور ہندوستانیت سے الگ نہیں کیا۔

سادگی و پرکاری: میر کے کلام کی دلآویزی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے واردات اور حالات کو ایسے پرتاثر، دل نشیں اور انوکھے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے، اور بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ ان اشعار میں کتنی معمولی بات کہی گئی ہے لیکن کتنے سادہ اور موثر انداز میں ۔

کہتا ہے دل کہ آنکھوں نے مجھ کو کیا خراب　　کہتی ہے آنکھ یہ کہ مجھے دل نے کھو دیا
لگتا نہیں پتا کہ صحیح کون سی ہے بات　　دونوں نے مل کے میر ہمیں تو ڈبو دیا

وحشت وجنوں کا مضمون نہایت پایمال ہے لیکن اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے کہ باوجود ہزاروں مرتبہ پڑھے جانے کے اس کی تاثیر میں کمی نہیں آتی ۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

حالؔی نے اس مضمون کے ۲۳۱ رشعر نقل کیے ہیں اور آخر میں لکھا ہے:

''مجھ کو ہرگز امید نہیں کہ متاخرین میں سے کسی نے اس سے بہتر چاک گریبان کا مضمون باندھا ہو۔''

اس کی دراصل وجہ ہے کہ میرؔ کے تخیل میں تجربہ کی آمیزش ہے۔ اس کے کلام میں جو ماورائی سادگی، راستی، معصومیت، خلوص اور شدت اثر ہے وہ یوں ہی نہیں آئی، خون جگر سے آئی ہے۔

ندرت: حسن کلام کے ارکان میں ندرت اور تازگی بیان کا درجہ بہت بلند ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معمولی خیال بھی حسن ادا اور تازگی بیان کی وجہ سے پسندیدہ بن جاتا ہے۔ میر کے یہاں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ ان اشعار میں کتنی عام اور پیش پا افتادہ باتیں ہیں لیکن کتنی صفائی اور ندرت کے ساتھ نظم ہوئی ہیں۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میرؔ کا غم زندگی کی بنیادی حقیقت ہے جس کے بغیر جمالی اور حیاتی بصیرتوں میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے اظہار کے لیے وہ جن الفاظ کا استعمال کرتے ہیں ان میں انتقال ذہن اور تلازم خیالات کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہر لفظ سے ایک تصور وابستہ ہے، اور ہر تصور کا ایک پس منظر ہے۔

سہل ممتنع: میرؔ کا کلام سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔ وہ سچا شاعر ہے اور اس کی شاعری سچی شاعری ہے۔ یہی وجہ ے کہ اس کی سلاست اور فصاحت اردو کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ سہل ممتنع، سادگی و حسن بیان کی اس صنعت کا نام ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص بظاہر یہ سمجھے کہ یہ بات میرے دل میں بھی تھی اور ایسا کہنا ہر شاعر کے لیے آسان ہے لیکن جب کوشش کر کے ویسا لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے، میر کے یہاں اس کی جابجا مثالیں ملتی ہیں۔

قدر رکھتی نہ تھی متاع — سارے عالم کو دیکھا

طنز: میر کے انداز و اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا طنزیہ لب ولہجہ ہے جو شاعرانہ آرٹ کا انتہائی نقطہ عروج ہے۔ میر کا طنز 'عنصری' قسم کا ہے۔ وہ مصائب عشق کا ذکر اس صبر و ضبط کے ساتھ کرتے ہیں کہ اس کا بیان تیر و پیکاں سے کم نہیں ہوتا۔ طنز کی نشتریت اس کی واقفیت میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور ظاہر

ہے کہ میر کی شاعری کی بنیاد، واردات پر قائم ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر
الحمد للہ ہو پوچھتے کیا اب حال اپنا ان کے ہی دل خواہ

میر کے اشعار ان کی سیرت کے آئینہ دار اور ان کی طبیعت کی ہو بہو تصویر ہیں۔ انھوں نے سنی سنائی نہیں بلکہ اپنے اوپر گزری ہوئی باتیں لکھی ہیں اسی لیے ان کے کلام میں بلا کا خلوص اور اثر ہے۔ خلوص، تکلف کا دشمن ہے۔ وہ اپنے اظہار کے لیے سادہ سے سادہ اسلوب تلاش کرتا ہے۔ یہی سادگی، دل کشی اور دلربائی کی خزینہ دار ہے۔

تشبیہیں اور رمزی علامتیں: میر تشبیہیں اور استعارے کم استعمال کرتے ہیں اور اگر کرتے ہیں تو بڑے سادہ اور سریع الفہم، ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے پھول پر شبنم۔ ان کی وجہ شبہ ہمیشہ قریبی اور مناسب حال ہوتی ہے۔ ان کے شعر میں الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ چمک اٹھتا ہے۔ میر کے اشعار کی علامتیں اور تشبیہیں سادہ ہیں لیکن ان میں بلا کا ایمائی اثر پوشیدہ ہے۔ اس لیے کہ وہ زیادہ تر ان کے تجربہ یا مشاہدہ سے اخذ کی گئی ہیں۔ گردش روزگار نے انھیں پیالہ وساغر کی طرح پھرایا تھا اور ان کے اندر تجربہ کی وسعت اور مشاہدہ کی قوت پیدا کردی تھی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ وہ اس درجہ تنہائی پسند اور مردم بیزار تھے کہ انھوں نے کبھی اپنے پائیں باغ پر بھی نظر نہیں کی تھی۔ یہاں اتنا اشارہ کافی ہے کہ میر کو غم دنیا اور غم معشوق دونوں سے سابقہ پڑا تھا اور ان دونوں نے مل کر ان کے کلام میں وہ گرمی پیدا کی ہے جو مے دو آتشہ میں ہوتی ہے۔ تجربات کے شیشہ میں پڑ کر اس میں وہ تیزی بھی آگئی ہے، جو تلوار میں ہوتی ہے۔ اصل یہ کہ آرٹ، بغیر مشاہدہ وتجربہ کے اور تفکر بغیر عمل کے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ صداقت نقل اور اندھی تقلید سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ تجربہ سے چشم دل میں نظر پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ شعر کی لذت، تحلیل ہوکر اثر بن جاتی ہے، ذرا یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیے

کیسی معمولی اور سادہ تشبیہ ہے اور میر کے مشاہدہ سے کتنی قریب۔ فراقِ یار میں عاشق کے دل کی جو حالت ہوجاتی ہے اس کی ہو بہو تصویر ہے۔ میر کا مشہور شعر ہے ۔

دل ہوا ہے چراغ مفلس کا شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے

دل افسردہ کو مفلس کا ٹمٹماتا ہوا چراغ کہنا نہایت بلیغ بات ہے۔ ہمارے تمام عوامی ادب میں تلاش کر لیجیے اس تصویر کا جواب مشکل سے ملے گا۔

میر کی زبان: 'ورڈز ورتھ' شاعری کے لیے بول چال کی عام زبان کو پسند کرتا ہے۔ میر نے اپنی شاعری میں یہی زبان استعمال کی ہے۔ میر کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر نورالحسن نقوی رقم طراز ہیں:

''میر شعر نہیں کہتے باتیں کرتے ہیں۔ وہ باتیں جو سننے والے کو ایسی لگتی ہیں جیسے پہلے سے اس کے دل میں موجود تھیں۔ انداز ایسا بے تکلف جیسے دوست اپنے دوست سے راز و نیاز میں محو ہو۔ لہجہ سرگوشی کا، زبان عام بول چال کی۔''

میرؔ کے کلیات میں ان گنت ایسے شعر موجود ہیں جن پر بات چیت کا گمان ہوتا ہے، اور میر کو اپنی اس خصوصیت پر ناز ہے۔ کتنے فخر سے کہتے ہیں:

ع: باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا

مگر یہاں ایک نکتے کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ شاعر بول چال کی زبان کو استعمال ضرور کرتا ہے مگر اسے شعری زبان بنا لیتا ہے۔ یہ کام آسان نہیں۔ عام بول چال کی زبان کو شعر کی زبان بنانے کے لیے شعری وسائل سے کام لینا پڑتا ہے۔ مطلب یہ کہ شاعر کہیں استعارہ و تشبیہ کا سہارا لیتا ہے۔ کہیں رمز و کنایہ کا، کہیں صنعت سے کام لیتا ہے تو کہیں پیکر تراشی سے۔ باپ کی وفات کے بعد میر کو اپنی کسمپرسی کا احساس ہوا تو ایک جگہ انھوں نے اس خیال کو تقریباً نثر کے انداز میں ادا کر دیا کہ

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا　　مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں

دوسری جگہ یہی تجربہ شعری انداز اختیار کر لیتا ہے

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں　　یاں کبھو سرو گل کے سایے تھے

آفتاب سے مراد ہے دھوپ۔ شاعر یہ کہتا ہے کہ میں دھوپ میں کھڑا ہوا ہوں تو مطلب یہ ہے کہ زمانے کے شدائد جھیل رہا ہوں اور جب کہتا ہے کہ کبھی میرے سر پر پھولوں اور خوب صورت پودوں کا سایہ تھا تو کہنا یہ چاہتا ہے کہ ایک زمانہ تھا جب مجھے ہر طرح کی آسائش میسر تھی۔ گویا دھوپ اور سایہ دو استعارے ہیں۔ ایک جگہ پھول کی بے ثباتی دکھانی مقصود ہے تو فرماتے ہیں

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

یہ شعر پیکر تراشی کا بہترین نمونہ ہے۔ پھول اور کلی دونوں نے جاندار کرداروں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اسے تجسیم کہتے ہیں۔ کلی کا تبسم نہایت معنی خیز ہے۔ پہلے تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ شاعر کا سوال بڑا مضحکہ خیز تھا۔ کلی اس احمقانہ سوال کا جواب کیا دیتی۔ طنز سے مسکرا دی کیوں کہ پھول کی زندگی اتنی مختصر ہے

کہ اس کے بارے میں پوچھنا نادانی ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ کلی کے مسکرانے میں بس ایک پل لگتا ہے۔ اشارہ یہ ہے کہ جتنی دیر کی میری مسکراہٹ ہے بس اتنی ہی پھول کی زندگی ہے۔ اب ملاحظہ ہوں بات چیت کی زبان میں چند شعر ۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ　　نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا
باہم سلوک تھے تو اٹھاتے تھے نرم گرم　　کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

غنائیت: موسیقی یا ترنم شاعری کے لیے بے حد ضروری ہے۔ جس طرح اچھی نثر کی خوبی یہ ہے کہ اسے بلند آواز سے پڑھا جائے تو کانوں کو حظ یعنی لطف حاصل ہو۔ اسی طرح اچھی شاعری اسے کہیں گے جسے گایا جاسکے۔ کولرج کے نزدیک نثر کی تعریف ہے: ''الفاظ بہترین ترتیب کے ساتھ' اور شعر کی تعریف: ''بہترین الفاظ بہترین ترتیب کے ساتھ''، شعر کے لیے شاعر پہلے تو بہترین لفظوں کا انتخاب کرتا ہے پھر انھیں بہترین ترتیب کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ میر کو لفظوں کے انتخاب اور ان کی ترتیب دونوں کا ہنر خوب آتا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موسیقی کے فن میں ماہر ہیں اور الفاظ کو اس طرح شعر میں بٹھاتے ہیں کہ دل کش ترنم پیدا ہو۔ کبھی کبھی لفظوں کی تکرار سے خوشگوار آہنگ پیدا کرتے ہیں۔

اشعار میر کی نغمگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ اسما کم اور افعال زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ بعض شعروں میں ایک سے زیادہ نحوی اکائیاں ہیں اور یہ بات طے شدہ ہے کہ افعال سے نغمگی پیدا ہوتی ہے۔ اب دیکھیے اس کی مثالیں ۔

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک　　مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا
عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا　　دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اس نغمگی کا دوسرا راز یہ ہے کہ میر کے کلام میں طویل مصوتوں کا استعمال زیادہ ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ فارسی عربی کی صفیری آوازوں کے ساتھ دیسی آوازوں کی آمیزش نے کلام میر کی موسیقیت میں اضافہ کیا ہے۔ غرض نغمگی و موسیقیت میر کی شاعری کی ایک امتیازی شان ہے۔ اسے ان کی صناعی اور شاعرانہ مہارت ہی کہا جاسکتا ہے کہ بھدا اور ثقیل لفظ بھی ان کے ہاتھ میں پہنچ کر موم ہو جاتا ہے۔ اور وہ جس طرح چاہتے ہیں اسے استعمال کرتے ہیں۔

پیکر تراشی: لفظوں کے ذریعے تصویر بنانا یعنی پیکر تراشی کلام میر کا وصف خاص ہے۔ یہ ایک ایسا شعری وسیلہ ہے جس سے کوئی حالت یا کوئی منظر قاری کے پیش نظر ہو جاتا ہے ظاہر ہے دیکھی ہوئی چیز سنی

ہوئی چیز سے زیادہ دل کش و پر اثر ہوتی ہے۔ میر اس راز سے بھی واقف ہیں اور فن پیکر تراشی سے متعلق ان کی معلومات بھی غیر معمولی ہیں۔ اس لیے میر کے کلام میں شعری پیکر ہر طرف بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں دو شعر مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے
رات محفل میں تیری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگادے کوئی دیوار کے ساتھ

استعارہ وتشبیہ: پیکر سازی میں استعارہ اور تشبیہ بہت معاون ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے محبوب کو چاند کہتا ہے تو چاند کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے۔ میر کے یہاں تشبیہیں زیادہ اور استعارے کم ملتے ہیں کیوں کہ تشبیہ سے وضاحت پیدا ہوتی ہے اور استعارے میں ایک طرح کا ابہام پایا جاتا ہے۔ میر تشبیہیں بھی ایسی انتخاب کرتے ہیں جن تک آسانی سے ذہن کی رسائی ہو جائے۔ دیکھیے اس کی چند مثالیں۔

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے   دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے   پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

سوز و گداز: میر نے ایک شعر میں اپنی قلمی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار   تیرا تو میر غم میں عجب حال ہوگیا

میرؔ کی سادگی، ان کا انداز بیان، ان کی دل گداختگی نے کلام میر میں بے پناہ تاثیر پیدا کر دی ہے۔ اور ان کا وہ مصرع بے اختیار یاد آتا ہے جو انھوں نے اپنے بارے میں کہا تھا۔

ع: منھ تکیے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا

☆☆☆

ڈاکٹر محسن رضا رضوی
صدر شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی، رابطہ نمبر:9431443778

نقش ہائے رنگ رنگ

اشاریۂ زبان وادب (ابتدا سے ۱۹۹۹ء تک) [مضامین]

مقالات/مضامین	مصنف	ماہ وسال	جلد	شمارہ
(آ)				
آتش پرست خلیل کی یاد میں (خلیل الرحمن اعظمی)	ظہیر ناشاد دربھنگوی	ستمبر ۱۹۸۱ء	۷	۹
آٹھویں دہائی کی ایک آواز: فخر الدین عارفی	نور الحسنین	مارچ تا جون ۱۹۹۹ء	۲۵	۳/۲
آٹھویں دہائی کی غزل	اسعد بدایونی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۴
آثار الصنادید: ایک جائزہ	خورشید پرویز صدیقی	جنوری، فروری ۱۹۹۵ء	۲۱	۱
آج کا ادب	پرویز شاہدی (مرحوم)	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
آخری مغلیہ عہد کے دو ممتاز مورخین	ڈاکٹر کاظم حسین	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳
آرزو جلیلی کے خطوط قاضی عبدالودود کے نام	مظہر امام	مارچ، اپریل ۱۹۹۱ء	۱۷	۲
آرہ کا ایک قدیم اردو گلدستہ	ش م عارف ماہر آروی	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۵
آرہ کے چند بلگرامی شعرا	ش م عارف ماہر آروی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۳
آزاد غزل اور قتیل شفائی	مظہر امام	اپریل تا جون ۱۹۸۲ء	۸	۲
آزادی کے بعد اردو مثنوی میں دانشوری	ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۴
آسٹرک خاندان کی بولیاں اور اردو	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
آل احمد سرور کا تنقیدی مزاج	سید احمد شمیم	جنوری، فروری ۱۹۹۹ء	۲۵	۱
آل احمد سرور کی تنقید نگاری	عبد المغنی	اپریل تا جون ۱۹۸۶ء	۱۲	۲
آں دہ کو چک کہ مردم خیز بود	عبدالقوی دسنوی	جنوری تا اپریل ۱۹۷۷ء	۴	۶

(ا)

ابلیس و بشر اور اقبال	ڈاکٹر محمد منصور عالم	اپریل تا جون ۱۹۸۷ء	۱۳	۲
ابوالفیض فیضی	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
ابوالاثر حفیظ جالندھری کی شاعری	منصور حسن	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
اثر عظیم آبادی: شاعر اور نقاد	ڈاکٹر اختر قادری	اپریل ۱۹۷۹ء	۵	۴
اجتبیٰ رضوی: بہار کا فلسفی شاعر	محمود علی خاں صبا	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
اجتبیٰ رضوی کی شاعری	قمر اعظم ہاشمی	اکتوبر ۱۹۷۷ء	۴	۸
اجتبیٰ رضوی کی شاعری میں 'آدم اکبر' کا تصور	ڈاکٹر عبدالواسع	جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء	۱۴	۱
اجتبیٰ رضوی کی قومی و وطنی شاعری	منظر اعجاز	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۲ء	۱۸	۶/۵
احسان دانش: شاعر فلسفہ کرب	شاہد رحیم	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
احسان عظیم آبادی	عبدالقادر احقر	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳
احمد حسین وافر جہانگیر نگری: حیات و کلام	کلیم سہسرامی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
احمد یوسف: اسلوب و مواد	تقی رحیم	جنوری تا مارچ ۱۹۸۷ء	۱۳	۱
اخبار المبشر	ڈاکٹر سید حسین احمد	نومبر، دسمبر ۱۹۹۵ء	۲۱	۶
اختر الایمان کی نظم (اور اب سوچتے ہیں): تجزیاتی مطالعہ	پروفیسر حامدی کاشمیری	جنوری، فروری ۱۹۹۷ء	۲۳	۱
اختر اورینوی اور جمالیات	سید غلام مرتضیٰ	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
اختر اورینوی: ایک دانشور صحافی	ڈاکٹر محمد محسن	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
اختر اورینوی: ایک دیدہ ور نقاد	اسلام عشرت	جولائی ۱۹۷۸ء	۵	۱۱
اختر اورینوی کا ناقدانہ مقام	شاداب رضی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴
اختر اورینوی کی ڈراما نگاری	مناظر عاشق ہرگانوی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
اختر اورینوی کی کہانی 'محشر' کا تجزیہ	نکہت خانم	اکتوبر ۱۹۷۷ء	۴	۸
اختر (اورینوی) صاحب: یادوں کے آئینے میں	رضا نقوی واہی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۴
اختر جونا گڑھی کی تصنیف	خورشید پرویز صدیقی	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۵/۴

اختر قادری: میری نظر میں	سید رضی الدین احمد	جنوری ۱۹۷۸ء	۴	۹
ادب اور اقدار و مقدار	ڈاکٹر کمال الدین	جنوری ۱۹۸۰ء	۶	۱
ادب اور انسان کا تصور	دیوندر اسر	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱
ادب اور سائنس	اندر جیت لال	اپریل ۱۹۷۹ء	۵	۴
ادب زندگی کی تنقید ہے	نرگس جہاں باروی	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
ادب کا لافانی کردار (امراؤ جان ادا)	شاہد جمیل	جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء	۱۴	۱
ادب میں تجربے کا مفہوم	شکیل الرحمٰن	جنوری تا مارچ ۱۹۸۶ء	۱۲	۱
ادبی اقدار اور جدت	رحمٰن حمیدی	اگست ۱۹۸۱ء	۷	۸
ادبی تنقید کی تدریس کا مسئلہ	ابوذر عثمانی	جنوری ۱۹۷۶ء	۲	۱
ادبی ممنونیت کا تصور	راشد شاذ	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
'ارباب سخن' (حسرت موہانی کا تذکرہ)	احمر لاری	اپریل تا جون ۱۹۸۲ء	۸	۲
اردو ادب اور جدید طرز احساس	ڈاکٹر احمد سجاد	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۵ء	۲۱	۵/۴
اردو ادب کی جاذبیت: فکر یا فن؟	شمیم الدین احمد	ستمبر ۱۹۸۱ء	۷	۹
اردو ادب کے ارتقا میں بہار کا حصہ (انیسویں صدی میں)	ڈاکٹر محمد ابراہیم	جنوری ۱۹۸۰	۶	۱
اردو ادب میں حقیقت پسندی اور مثالیت کا اظہار	اشرف صدیقی	اپریل ۱۹۷۹ء	۵	۴
اردو افسانہ: ابتدا و ارتقا	مصطفٰی کمال	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۳
اردو افسانہ: امکانات کی تلاش	پروفیسر حامدی کاشمیری	مارچ تا جون ۱۹۹۹ء	۲۵	۳/۲
اردو افسانہ: ترقی پسند تحریک کے بعد	ارون کمار پانڈے	جنوری تا مارچ ۱۹۸۷ء	۱۳	۱
اردو افسانے کے اسّی سال	مظہر امام	اکتوبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۰
اردو افسانے کی تنقید	احمد یوسف	جنوری تا مارچ ۱۹۸۶ء	۱۲	۱
اردو افسانے کی تنقید	احمد یوسف	مارچ، اپریل ۱۹۹۷ء	۲۳	۲
اردو افسانے میں جدیدیت	شہزاد منظر	جولائی ۱۹۷۶ء	۲	۴
اردو افسانے میں حقیقت کا عمل	ڈاکٹر قدوس جاوید	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
اردو اور روسی زبان	علی عباس عزل	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲

اردو اور کلچر کی تقسیم	پروفیسر وہاب اشرفی	اپریل تا جون ۱۹۸۹ء	۱۵	۲
اردو اور ہندوستانیت	رشید احمد	جون ۱۹۸۰ء	٦	٦
اردو بنگلہ دیش میں: ایک انشائیہ	قاضی محی الدین	اگست ۱۹۷۹ء	۵	۸
اردو پر تمل کے اثرات	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۳
اردو پر دوسری زبانوں کے اثرات	تنویر اختر رومانی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۲ء	۸	۱
اردو تعلیم: چراغ تلے اندھیرا	خورشید جہاں اشرف	اپریل ۱۹۷۹ء	۵	۴
اردو تحقیقات ادبیہ میں ایک اضافہ	سید محمد حسنین	نومبر، دسمبر ۱۹۹۵ء	۲۱	٦
اردو تحقیق: چند مسائل	قیصر ضحیٰ عالم	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴
اردو تلفظ: چند معروضات	ڈاکٹر رئیس انور	مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء	۱٦	۲
اردو تنقید اور آل احمد سرور	ہمایوں اشرف	جولائی، اگست ۱۹۹۱ء	۱۷	۴
اردو تنقید کی موجودہ روش	قمر اعظم ہاشمی	اپریل تا جون ۱۹۸۲ء	۸	۲
اردو داستانوں کے متبدلہ اقسام	مجید بیدار	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۴
اردو شاعری میں استادی شاگردی کی روایت	سید نہال اختر	اکتوبر ۱۹۷٦ء	۳	۵
اردو شاعری میں دوہے	ڈاکٹر ارتضیٰ رضوی	جنوری تا اپریل ۱۹۹۲ء	۱۸	۱/۲
اردو شاعری میں شخصیت کا تصور	قاضی عبدالوارث	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۳
اردو شاعری میں طنز لطیف	شاہ فضل امام واقف آروی	اکتوبر ۱۹۷۷ء	۴	۸
اردو شاعری میں قومی یکجہتی	محمد شہاب الدین	مئی، جون ۱۹۹۰ء	۱٦	۳
اردو شاعری میں گیت	رفیع حیدر انجم	جنوری تا مارچ ۱۹۸٦ء	۱۲	۱
اردو شاعری میں مانوس سہسرامی کا مقام	خالد سجاد	اپریل تا جون ۱۹۸۷ء	۱۳	۲
اردو شاعری میں مجاز کی جلوہ گری	ناصر جلالی	جولائی ۱۹۷۸ء	۵	۱۱
اردو شعرا کا ادراک	محمد منصور عالم	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳
'اردو شعرا کا تنقیدی شعور': ایک مطالعہ	فصیح الزماں	اگست ۱۹۸۱ء	۷	۸
'اردو شعرا کا تنقیدی شعور': ایک مطالعہ	فصیح الزماں	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
اردو غزل کی روایت اور اقبال	رضوان احمد خاں	جولائی تا ستمبر ۱۹۸٦ء	۱۲	۳

اردو غزل میں تصوف اور تفلسف کا امتزاج	ڈاکٹر یوسف خورشیدی	اپریل ۱۹۷۸ء	۴	۱۰
اردو غزل میں خارجیت اور داخلیت کا عکس رنگیں	رعنا ارم	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
اردو غزل میں رمزیت اور اس کے گوشے	عرش ملسیانی	جولائی ۱۹۷۶ء	۲	۴
اردو فن پاروں میں علاقائی لسانی تہذیب	احمد بدر	مئی، جون ۱۹۹۱ء	۱۷	۳
اردو کا پہلا سانیٹ نویس	محمد محفوظ الحسن	جنوری ۱۹۷۶ء	۲	۱
اردو کا تحقیقی سرمایہ (ابتدا سے قاضی عبدالودود تک)	ڈاکٹر محمد منصور عالم	جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء	۱۴	۱
اردو کی پہلی منظوم تفسیر	حاذق ضیائی سہسرامی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳
اردو کی پہلی ناول نگار خاتون	شعیب عظیم	مئی، جون ۱۹۹۱ء	۱۷	۳
اردو کی شعری روایت اور قومی یکجہتی	ابوذر عثمانی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء	۱۱	۱
اردو کی صوفیانہ شاعری	ڈاکٹر کاظم ہاشمی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
اردو کے افسانوی ادب میں انسان دوستی کا تصور	علی احمد فاطمی	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء	۲۵	۴ تا ۶
اردو کے ذریعہ اسلام کی خدمات (چودھویں صدی ہجری میں)	عبدالقوی دسنوی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۴
اردو کے غیر مسلم شعرا	ایس اے شکیل	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۳
اردو کے موجودہ ادیبوں کی اپنے ماحول سے لاتعلقی	ڈاکٹر سید عبدالباری	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
اردو گیت: قومی یکجہتی کی ایک مثال	شہلا بانو	جنوری، فروری ۱۹۹۷ء	۲۳	۱
اردو لغت اور املا	عزیز الرحمن پھنہروی	جولائی ۱۹۸۱ء	۷	۷
اردو مرثیہ کا ایک گمشدہ باب: بہار حسین آبادی	محسن رضا رضوی	مارچ تا جون ۱۹۹۹ء	۲۵	۲/ ۳
اردو مرثیہ نگاری اور مرزا دبیر	پروفیسر کلیم سہسرامی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۹ء	۱۵	۱
اردو میں ادب اطفال	ڈاکٹر مظفر حنفی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳
اردو میں بچوں کا ادب	مناظر عاشق ہرگانوی	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء	۲۵	۴ تا ۶
اردو میں بچوں کا ادب، تراجم، تکنیکی اور مذہبی کتابیں	ڈاکٹر مظفر حنفی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳
اردو میں پریم چند کی بنیادی خدمت	علی احمد فاطمی	ستمبر ۱۹۸۱ء	۷	۹

اردو میں پہلا نفسیاتی ناول	محمد مظاہر الحق	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
اردو میں توابع اور مہملات (مطالعہ زبان)	پروفیسر سید حسن	اپریل ۱۹۷۹ء	۵	۴
اردو میں جملوں کے مابین ربط	قیصر ضحیٰ عالم	جنوری تا اپریل ۱۹۹۲ء	۱۸	۱/۲
اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ	علی عباس عزل	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
اردو میں رپورتاژ نگاری کا فن	ڈاکٹر ایس ایم زیڈ گوہر	مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء	۱۶	۲
اردو میں کوئی مصوتہ یا نیم مصوتہ نہیں	ایم عزیز الحسن	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء	۹	۴
اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم	عتیق احمد صدیقی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء	۹	۴
اردو میں ہندوؤں کی مذہبی کتابیں	سید نہال اختر	اپریل ۱۹۷۶ء	۲	۲
اردو ناول ۱۹۴۷ء کے بعد	ثریا حسین	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳
اردو ناول کا ارتقا	ولی احمد ولی	جنوری، فروری ۱۹۹۰ء	۱۶	۱
اردو ناول میں عورت کا تصور	صغریٰ مہدی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء	۱۴	۱
اردو ناول نگاری میں عزیز احمد کا مقام	ڈاکٹر شمیم افزا قمر	مئی ۱۹۸۰ء	۶	۵
اردو ناولوں کی موضوعاتی تشکیل	مجید بیدار	اپریل تا جون ۱۹۸۶ء	۱۲	۲
اردو نثر میں پیروڈی کا فنی ارتقا	قطب الدین اشرف	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۴
اردو نثر میں ظرافت کے مختلف رجحانات	ظفر کمالی	مئی، جون ۱۹۹۱ء	۱۷	۳
اردو نستعلیق لائنو ٹائپ	ڈاکٹر شارب ردولوی	جنوری ۱۹۸۰ء	۶	۱
اردو واسوخت میں نامہ و پیام	زین العابدین	جنوری تا مارچ ۱۹۸۷ء	۱۳	۱
اردو ہندی زبان کا باہمی رشتہ	شفیق عارفی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
ارشد کاکوی: دیدہ وشنیدہ	افتخار اجمل شاہین	اگست ۱۹۸۱ء	۷	۸
اڑیا زبان اور ادب	کرامت علی کرامت	اکتوبر ۱۹۷۶ء	۳	۵
اسلوب: ایک وسیلۂ شخصیت شناسی	سید محمد حسنین	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۳
اسلوب کیا ہے؟	منصور صدیقی بندھولوی	جون ۱۹۸۰ء	۶	۶
اسلوب گفتگو	جوہر نظامی	جنوری ۱۹۷۹ء	۵	۱
اسمیہ زبان وادب	تاراچرن رستوگی	جولائی ۱۹۷۶ء	۲	۴
اصلاح املا سے متعلق تجاویز: ایک مختصر جائزہ	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء	۲۰	۵/۶

اضافی تنقید کی تخلیقی شخصیت	یوسف جمال	ستمبر ۱۹۸۱ء	۷	۹
اظہر نامہ (مرتضیٰ اظہر رضوی)	احتشام احمد قادری	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء	۲۰	۶/۵
اعجاز شاہین: اپنے افسانوں کے آئینہ میں	مسز شبنم خاں	جولائی، اگست ۱۹۹۱ء	۱۷	۴
اعلیٰ حضرت برنی صاحب کا اقبالیات میں مقام	ڈاکٹر تارا چرن رستوگی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء	۱۴	۱
اغلاط نامہ	خورشید پرویز صدیقی	جولائی، اگست ۱۹۹۴ء	۲۰	۴
افسانے کی عصری حسیت	قمر اعظم ہاشمی	اکتوبر ۱۹۷۶ء	۳	۵
اقبال اور انجمن حمایت اسلام	جگن ناتھ آزاد	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
اقبال اور بیدل	محمد سمیع الحق	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
اقبال اور تصوف	بدر جہاں	جولائی ۱۹۸۰ء	۶	۷
اقبال اور علی گڑھ	عبدالقوی دسنوی	اپریل ۱۹۷۸ء	۴	۱۰
اقبال اور گوئٹے	تارا چرن رستوگی	جنوری ۱۹۷۶ء	۲	۱
اقبال اور ملٹن	تارا چرن رستوگی	جولائی ۱۹۷۷ء	۴	۷
اقبال: جدوعمل اور سعی پیہم کا پیامی	حفیظ بنارسی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
اقبال سے متعلق سہیل عظیم آبادی کے خیالات	ڈاکٹر تارا چرن رستوگی	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
اقبال کا انسان کامل	غلام مصطفیٰ ایڈوکیٹ	اپریل تا جون ۱۹۸۸ء	۱۴	۲
اقبال کا پیام نوجوانوں کے نام	نبی احمد اطہر	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
اقبال کا تصور وطنیت	مجید بیدار	جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء	۱۰	۱
اقبال کا سفر بہار	جگن ناتھ آزاد	اپریل ۱۹۷۶ء	۲	۲
اقبال کا فن اور اسلوب وزبان	اسلم اعظمی	جنوری ۱۹۷۸ء	۴	۹
اقبال کا مکالماتی طرز بیان	سید کامران رضا کاظمی	جولائی ۱۹۸۰ء	۶	۷
اقبال کا نظریہ تعلیم	ظفر حبیب	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۴
اقبال کا نظریہ فن	ڈاکٹر قدوس جاوید	اپریل ۱۹۷۸ء	۴	۱۰
اقبال: کلیم الدین احمد کی نظر میں	ڈاکٹر حمیرا خاتون	جولائی ۱۹۷۸ء	۵	۱۱
اقبال کی فارسی غزل گوئی	طلحہ رضوی برق	جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء	۱۰	۱
اقبال کی ہیئتی اختراعات	سلیم شہزاد	اگست ۱۹۷۹ء	۵	۸

اقبال کے چند شخصیاتی معروضی تلازمے	ڈاکٹر صادق	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۵/۴
اقبال کے گلزار فن کے چند خارزار	انیس فاطمہ	مارچ، اپریل ۱۹۹۵ء	۲۱	۲
اقبالیت کی کشمیریت	کمال احمد صدیقی	جنوری تا اپریل ۱۹۹۴ء	۲۰	۲/۱
اکبر الہ آبادی	عطاءاللہ پالوی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۳
اکبر الہ آبادی: غزل کے آئینے میں	ناز قادری	اکتوبر ۱۹۷۸ء	۴	۱۲
اکبر الہ آبادی کے سن ولادت کی تصحیح	ڈاکٹر محمد عزیز الرحمن	جولائی ۱۹۸۱ء	۷	۷
اکبر کی غزل گوئی	انور ظہیر خاں	نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۶
اکبر کی مزاحیہ شاعری کا فن	تاج پیامی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء	۱۱	۱
اکثر یاد آتے ہیں: کرشن چندر	مظہر امام	مئی تا اگست ۱۹۹۲ء	۱۸	۴/۳
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم (جمیل مظہری کی یاد میں)	شمیم صادقہ	جنوری تا مارچ ۱۹۸۲ء	۸	۱
'الپنچ' اور شاد کا معرکہ	احمد جمال پاشا	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
الفاظ: ماہیت کی بحث	ڈاکٹر رئیس انور	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳
الفتی عظیم آبادی: بحیثیت شاعر	ڈاکٹر محمد قیس مسرت	جولائی ۱۹۷۹ء	۵	۷
الکٹرونک میڈیا اور اردو معاشرہ	لطف الرحمن	جولائی، اگست ۱۹۹۰ء	۱۶	۴
المیہ نگاری: فکر اور فن	محمد سمیع الحق	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء	۱۹	۴تا۶
الوداع! ساتھی سہیل عظیم آبادی	کاشی ناتھ پانڈے	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱تا۴
'الہلال' اور سید سلیمان ندوی	محمد نعیم صدیقی	جنوری ۱۹۷۹ء	۵	۱
امجد نجمی کی فارسی شاعری	کرامت علی کرامت	مئی، جون ۱۹۹۶ء	۲۲	۳
امراؤ جان ادا	طلعت حسین نقوی	اگست ۱۹۷۹ء	۵	۸
امیر خسرو اور ہندوستانی معاشرتی اقدار	قمر الدین	اپریل ۱۹۷۶ء	۲	۲
انجم مانپوری	معین شاہد	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
انداز بیان غالب	فیاض عالم ولی اللہی	جولائی ۱۹۷۸ء	۵	۱۱
انڈمان میں صادق پور کے باغی علما	شعیب شمس	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء	۱۹	۴تا۶
انشائیہ	تاج پیامی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
انشائیہ کی ہیئت کے تعین کا مسئلہ: چند اشارے	ابوذر عثمانی	جنوری تا اپریل ۱۹۷۷ء	۴	۶

انشائیہ کے بارے میں کچھ اور باتیں	ڈاکٹر علیم اللہ حالی	جولائی ۱۹۷۸ء	۵	۱۱
'انقلاب': ایک تجزیہ	عظیم اقبال	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
'انگاروں کا شہر': ایک جائزہ	ناصر جلالی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء	۱۰	۱
انگارے کی روایت	قمر رئیس	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱
انگریزی انشائیے پر ایک نظر	اندرجیت لال	جولائی ۱۹۷۷ء	۴	۷
انیس رفیع: اردو افسانے کا معتبر نام	نسیم احمد نسیم	نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۶
انیس کی مرثیہ نگاری	سید احمد شمیم	جولائی ۱۹۷۹ء	۵	۷
۱۹۷۹ء: بچوں کا عالمی سال	طلعت فاطمہ	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
۱۹۷۹ء میں بچوں کی فلاح و بہبود	قمر النسا بیگم	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
۱۹۸۰ء کے بعد اردو غزل کی صورت حال	راشد طراز	مارچ تا جون ۱۹۹۹ء	۲۵	۲/۳
۱۹۷۰ء کے بعد کے چند ناول	احمد یوسف	جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء	۱۰	۱
اویس احمد دوراں: شخص اور شاعر	ایم اے شمسی دوگھروی	جنوری، فروری ۱۹۹۹ء	۲۵	۱
اویس احمد دوراں: 'لمحوں کی آواز' سے 'ابابیل' تک	ایم اے شمسی دوگھروی	جنوری، فروری ۱۹۹۰ء	۱۶	۱
ایران صغیر کشمیر کا ایک گمنام شاعر	محمد رضوان الحق ندوی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
ایران کا انیس	سید حسن	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱
'ایران کی لیلیٰ'	عبدالغفار انصاری	ستمبر ۱۹۷۹ء	۵	۹
ایرانی تصوف: ایک جائزہ	پروفیسر محمد مطیع الرحمن	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۵ء	۲۱	۴/۵
ایک بات	زکی انور	اپریل ۱۹۷۹ء	۵	۴
'ایک چادر میلی سی': ایک مطالعہ	رضوان اللہ ندیم	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
ایک شخص ایک انجمن: مفتی عتیق الرحمن انصاری	عنوان چشتی	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
ایک قدیم شعری مخطوطے کی ایڈیٹنگ اور اس پر تبصرہ	ڈاکٹر رئیس انور	مارچ، اپریل ۱۹۹۵ء	۲۱	۲
'ایک ندی ریت بھری' تختہ گلاب ہے	ڈاکٹر لطف الرحمن	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
'ایک ندی ریت بھری': نئے انداز کی نظمیں	شفیع جاوید	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳

'ایوانِ غزل': ایک تنقیدی جائزہ	عبدالمغنی	جولائی ۱۹۷۶ء	۲	۴

(ب)

بابائے اردو سے پہلی ملاقات	مسعود احمد برکاتی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۶ء	۱۲	۱
بابائے اردو کی قواعد اردو	ایم عزیز الحسن	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۳
بابائے اردو کی قواعد اردو (قسط-۲)	ایم عزیز الحسن	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴
بارہ ماسہ کنول دی	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	جولائی ۱۹۸۱ء	۷	۷
بارے کچھ ذکر ہو کتابوں کا (قسط اول)	احمد یوسف	نومبر دسمبر ۱۹۹۵ء	۲۱	۶
بارے کچھ ذکر ہو کتابوں کا (دوسری قسط)	احمد یوسف	نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۶
بارے کچھ ذکر ہو کتابوں کا	احمد یوسف	مارچ تا جون ۱۹۹۹ء	۲۵	۲/۳
بازیافت پرویز شاہدی	ڈاکٹر رئیس انور	اپریل تا جون ۱۹۸۹ء	۱۵	۲
'باغ و بہار': تنقید و تحقیق کی کجی	صفدر امام قادری	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
'باغ و بہار' کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	نسرین ممتاز بصیر	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
'باغ و بہار' کے ساتھ ہماری تنقید کا انصاف	فیاض احمد	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
باقیاتِ شاد (اشاعت ثانی، بہ ترمیم و اضافہ)	نقی احمد ارشاد	مارچ ۱۹۹۱ء	ندارد	ندارد
بجوکا کی تخلیقی معنویت	افصح ظفر	جنوری تا اپریل ۱۹۹۲ء	۱۸	۱/۲
بچوں کا ادب	معین الدین	اپریل ۱۹۷۶ء	۲	۲
بچوں کا ادب	احمد جمال پاشا	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
بچوں کا شعری ادب	افروز کوثر	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
بچوں کی دیکھ بھال	تابندہ احمد	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
بچوں کی لائبریری: وقت کی ایک اہم ضرورت	سیمیں ثمر	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
بچوں کی مصوری	اندرجیت لال	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
بچوں کی واحد تعلیم گاہ	عبدالمغنی	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
بچوں کے ادب میں شہباز کا حصہ	ڈاکٹر ممتاز احمد	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
بچوں کے تعلیمی مسائل	شہیر امام	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲

بچوں کے جبلی میلانات اور ان کی تربیت	پروفیسر محمد سلیمان	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
بچوں کے حقوق	قمر النسا بیگم	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
بچوں کے خواب	اندرجیت لال	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
بچوں کے لیے اقبال کی نظمیں	ملکہ خورشید	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
بچوں کے مسائل: چند یادیں	مبینہ امام	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
بچوں کے مسائل کا تنقیدی جائزہ	عشرت بانو	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
بچوں میں چوری کی عادت	سید محمد محسن	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
برق کا آسمان پر ہے دماغ (جانے والوں کی یاد)	احمد یوسف	جنوری تا اپریل ۱۹۹۴ء	۲۰	۱/۲
بزم فرخ ناٹک معروف بہ فرخ سبھا حافظ	ظفر کمالی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
بزم ہولی (راغب کی مثنوی - سلسلہ نمبر ۹)	کاظم حسین	جنوری تا مارچ ۱۹۸۷ء	۱۳	۱
بسمل دربھنگوی: ایک تعارف	محمد ضمان اللہ ندیم	جولائی، اگست ۱۹۹۰ء	۱۶	۴
بنتے مٹتے تاثر (سہیل عظیم آبادی)	شمیم صادقہ	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
بنگال میں اردو اور مشرقی بنگال میں اردو	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۵/۶
بنگال میں اردو تذکرہ نگاری: ایک جائزہ	ڈاکٹر رئیس انور	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
بنگالی ادیبوں کی داستان حیات معاشقہ	معصوم شرقی	مئی، جون ۱۹۹۶ء	۲۲	۳
بنگلہ ادب میں نئے رجحانات	پرویز شاہدی (مرحوم)	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۲/۳
بنگلہ دیش کا اردو ادب	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۵/۶
بنگلہ دیش کے بنگالی نژاد اردو شعرا	کلیم سہسرامی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۳
بنگلہ دیش کے چند اہم اردو جرائد	ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۳
بنگلہ دیش میں ادبی انجمنوں کا سفر (۱۹۴۷ء تا ۱۹۸۶ء)	ایوب جوہر	جنوری تا مارچ ۱۹۸۷ء	۱۳	۱
بنگلہ دیش میں اردو افسانہ	اکرام الحق اورنگ	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۳
بنگلہ دیش میں اردو افسانے اور افسانہ نگار	ایوب جوہر	مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء	۱۶	۲
بنگلہ ڈراما: تقسیم ملک کے بعد	ڈاکٹر کلیم سہسرامی	جنوری تا اپریل ۱۹۹۲ء	۱۸	۱/۲

بنگلہ کہانی: سرت چندر چٹرجی سے اب تک	انیس رفیع	جولائی، اگست ۱۹۹۱ء	۱۷	۴
بہار اسکول اورشاد	جوہر نظامی	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۲/۳
بہار: اکبر کا وطن مالوف	ڈاکٹر محمد عزیز الرحمن	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۵/۶
بہار کا اردو افسانہ: ۱۹۹۰ء میں	فخرالدین عارفی	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
بہار کا انتقادی ادب: ساتویں دہائی میں	ارتضیٰ کریم	اپریل تا جون ۱۹۸۴ء	۱۰	۲
بہار کا ایک قدیم مذہبی وتاریخی شہر: ویشالی	ضیاءالدین اصلاحی	جنوری، فروری ۱۹۹۷ء	۲۳	۱
بہار کا پریم چند: سہیل عظیم آبادی	صبا عظیم آبادی	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
بہار کی اردو صحافت: ۱۸۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک	نصر وارثی اوگانوی	جولائی ۱۹۷۸ء	۵	۱۱
بہار کی ایک عظیم شخصیت مولانا محمد سہول عثمانی	عبدالغفار انصاری	جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء	۱۰	۱
بہار کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ (نثار کبریٰ)	محمد شفیق الزماں	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
بہار کی خواتین افسانہ نگار	ڈاکٹر احمد حسین آزاد	جولائی ۱۹۷۹ء	۵	۷
بہار کے چند تاریخی نکات واثرات	معین شاہد	اپریل تا جون ۱۹۸۹ء	۱۵	۲
بہار کے سات جدید افسانہ نگار	نثار احمد صدیقی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
بہار کے عظیم ترین صوفی بزرگ: یحییٰ منیری	ڈاکٹر سمیع الحق	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
بہار کے مدارس، کالج اور یونیورسٹیوں میں عربی کی تعلیم اور اس کے مسائل	سید اطہر شیر	جنوری تا مارچ ۱۹۸۶ء	۱۲	۱
بہار میں اردو افسانہ	احمد یوسف	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۳
بہار میں اردو افسانہ: ۱۹۴۶ء کے آس پاس	مظہر امام	اپریل تا جون ۱۹۸۹ء	۱۵	۲
بہار میں اردو افسانہ نگاری	ڈاکٹر احمد حسین آزاد	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۵/۶
بہار میں اردو سوانح نگاری	عبدالواسع	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱
بہار میں اردو شاعری کی روایتیں	شمس الضحیٰ شمس جالوی	جولائی، اگست ۱۹۹۴ء	۲۰	۴
بہار میں اردو صحافت	سید احمد قادری	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
بہار میں اردو طنز وظرافت	سید احمد قادری	اپریل تا جون ۱۹۸۸ء	۱۴	۲
بہار میں اردو مثنوی کا ارتقا: ایک جائزہ	ڈاکٹر سید حسین احمد	مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء	۱۶	۲
بہار میں تنقید کا ارتقا	صابرین خاتون	مئی، جون ۱۹۹۰ء	۱۶	۳

بہار میں جدید افسانے کی رفتار	نثار احمد صدیقی	اپریل تا جون ۱۹۸۹ء	۱۵	۲
بہار میں جدید غزل اور آوازوں کی شناخت	شاہد کلیم	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۳
بہار نے شاد کے لیے کیا کیا	مہدی علی	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
بیٹ جنریشن (Beat Generation)	کمار بمل (ہندی)	مئی ۱۹۸۰ء	۶	۵
	عصمت جہاں (اردو)			
'بے جڑ کے پودے': ایک مطالعہ	ڈاکٹر آصفہ واسع	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
'بے جڑ کے پودے' کا تخلیقی پس منظر	عظیم اقبال	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
'بے جڑ کے پودے': ایک تنقیدی جائزہ	اسلام عشرت	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
بیدی کا فن	سید طلعت حسین نقوی	مئی ۱۹۸۰ء	۶	۵
بیدی کے افسانے میں عورت کا تصور	قاضی عبید الرحمن ہاشمی	جنوری، فروری ۱۹۹۹ء	۲۵	۱
بیدی کے مسلم کردار	ناوک حمزہ پوری	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء	۲۰	۶/۵
بیرم خاں خانخاناں: شخصیت، کارنامے اور فن	بدیع الزماں اعظمی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
بی زیڈ مائل: ایک کج کلاہ شاعر	منظر شہاب	جنوری تا اپریل ۱۹۹۴ء	۲۰	۲/۱
بیسویں صدی میں اردو تراجم وتفاسیر قرآنی کی نثر	محمد رضوان احمد خاں	جنوری تا مارچ ۱۹۸۹ء	۱۵	۱
بے نام کتاب کا دیباچہ	ڈاکٹر شکیب ایاز	جولائی، اگست ۱۹۹۴ء	۲۰	۴
بھاگلپور واطراف کے چند قدیم اردو شعرا	عبدالرزاق	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
بھوپالی اردو	ڈاکٹر عبدالودود	جولائی ۱۹۸۱ء	۷	۷
بھوج پوری زبان وادب	سورن کرن			
	ترجمہ: عبدالخالق	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱
بھوج پوری لوک گاتھائیں	عبدالخالق	جنوری ۱۹۷۶ء	۲	۱

(پ)

پانچ زبانوں کی ایک مشہور نعت اور اس کے مصنف	غلمان یزدانی	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
پر پرواز تصوف	قیوم خضر	نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۶

پردھان قبیلے کے گیتوں میں اردو فارسی الفاظ	ڈاکٹر سید حامد حسین	جنوری تا اپریل ۱۹۷۷ء	۴	۶
پرویز شاہدی	سالک لکھنوی	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی: ایک شاعر، ایک بشر	ڈاکٹر حمیرا خاتون	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی: ایک مطالعہ	ناصر زیدی	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی: ایک مطالعہ	سید احمد قادری	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
پرویز شاہدی: ایک نظر میں	مرتب: قمر عالم ملک	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی: ایمان و یقین کا شاعر	عظیم اقبال	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی پر نگاہ طائرانہ	جوہر نظامی	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی: چند یادیں، چند باتیں	شانتی رنجن بھٹا چاریہ	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی کا ارتقائی سفر	مظہر امام	جولائی، اگست ۱۹۹۰ء	۱۲	۴
پرویز شاہدی کا ذہنی سفر	نصر غزالی	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی کا طرز سخن	صبا عظیم آبادی	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی کا نظریہ حیات	خورشید عیسیٰ	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز صاحب	مظہر امام	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی سے چند ملاقاتیں	حبیب الرحمن	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی کی شاعری	محمد نور الہدیٰ	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی کی شاعری: تدریجی مطالعہ	رئیس انور رحمن	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی کی شاعری کا نیا دور	سید ظہیر احسن	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی کی شاعری میں شعری پیکر تراشی	ڈاکٹر عبد المنان	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی: غزل کے آئینے میں	نور الاسلام صدیقی	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی: فکر و فن کے آئینے میں	محمد سمیع احمد	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی کی شناخت	ڈاکٹر محمد منصور عالم	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی کی غزلیں	ڈاکٹر حمیرا خاتون	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی کی فن کاری	ڈاکٹر اختر اورینوی	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
پرویز شاہدی کے فکر و فن کا اجمالی جائزہ	ظہیر ناشاد در بھنگوی	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲

پریم چند: اردو فکشن کی آبرو	ڈاکٹر محمد اختر الحسن	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
پریم چند اور اردو رسم الخط	ڈاکٹر محمد یونس	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
پریم چند اور اقبال	جگن ناتھ آزاد	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
پریم چند اور قومی یکجہتی	شین مظفر پوری	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
پریم چند جنگ آزادی کی حمایت میں	صغیر افراہیم	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
پریم چند، شرت چندر اور ٹیگور	قدوس جاوید	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
پریم چند: عمرانی مطالعہ	ابن فرید	جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء	۱۰	۱
پریم چند کا افسانہ 'جیل': ایک مطالعہ	احمد یوسف	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
پریم چند کا افسانہ 'دو بیل'	شکیب ایاز	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
پریم چند کی شخصیت کے چند پہلو	شہباز حسین	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
پریم چند (منشی) کا شعور زبان	ڈاکٹر عبدالرؤف	اپریل ۱۹۸۰ء	۶	۴
پریم چند کا نقطۂ نظر	قدوس جاوید	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
پریم چند کے افسانوں میں مقامی رنگ	ڈاکٹر وہاب اشرفی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
پریم چند کے افسانے: فنی نقطۂ نظر سے	کلام حیدری	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
پریم چند کے سیاسی نظریے	لطف الرحمن	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
'پس چہ باید کرد......' پیغام اقبال	تارا چرن رستوگی	جولائی ۱۹۷۸ء	۵	۱۱
پطرس: ایک مصلح ادب	ایم اے مشتاق	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۵
پنڈت پنت: ہندی کا ایک عظیم شاعر	فضل الرحمن ہاشمی	نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۶
پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان اردو اور مراٹھی افسانہ	سلام بن رزاق	اپریل تا جون ۱۹۸۷ء	۱۳	۲
پیارے زکی بھائی	محمد سالم	اپریل ۱۹۷۹ء	۵	۴
پھول بن	طلعت حسین نقوی	جولائی ۱۹۸۱ء	۷	۷
پھول مرجھا گیا خوشبو کا سفر جاری ہے (پرویز شاہدی)	پروفیسر اعزاز افضل	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۲/۳

(ت)

تابانی سہیل	محمد عبدالقادر احقر	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
تاثراتی اور جمالیاتی تنقید کا ایک طائرانہ جائزہ	عمیر احمد ثاقب	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴
تاجور نجیب آبادی	جگن ناتھ آزاد	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱
تاریکی کی تہہ سے اجالے کی نمود	قیوم خضر	مئی تا اگست ۱۹۹۲ء	۱۸	۳/۴
تبصرہ نگاری اور اس کے مناصب	شاہد کلیم	اپریل تا جون ۱۹۸۳ء	۹	۲
تجربہ یا تخریبہ (ظفر حمیدی کی ۱۳ غزلوں کا جواب)	پروفیسر طلحہ رضوی برق	مارچ، اپریل ۱۹۹۱ء	۱۷	۲
تجلیات قتیل دانا پوری: ایک مطالعہ	حفیظ بنارسی	اپریل تا جون ۱۹۸۷ء	۱۳	۲
تجھے بھی جانچتے (مظہر امام)	محمد منصور عالم	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
تجھے ہم ولی سمجھتے......	سید احمد قادری	جنوری ۱۹۸۰ء	۶	۱
تحقیق اور تنقید: ایک سرسری جائزہ	ڈاکٹر خورشید سمیع	مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء	۱۶	۲
تحقیق اور تنقید	پروفیسر خورشید سمیع	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۵/۶
تخلیق	تاج پیامی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴
تخلیقی ادب: جواز اور منصب	طارق سعید	ستمبر ۱۹۷۹ء	۵	۹
تخلیقی اظہار: فطری نمود یا ارادی تشکیل	ڈاکٹر حسین الحق	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
تدریس ادب اور ڈاکٹر محمد حسن	قاضی شعیب	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
'تذکرۂ بزم شمال' (جلد اول) مصنفہ: شاداں فاروقی	ظفر حبیب	مئی، جون ۱۹۹۱ء	۱۷	۳
'تذکرۂ شورش' مرتبہ کلیم الدین احمد	سید حسین احمد	جولائی، اگست ۱۹۹۱ء	۱۷	۴
'تذکرۂ ماہ وسال': ایک جائزہ	ڈاکٹر سید حسین احمد	جنوری تا جون ۱۹۹۳ء	۱۹	۱ تا ۳
'تذکرۂ ماہ وسال': مطالعہ وجائزہ	محمد اسلم ر عطا عابدی	مئی، جون ۱۹۹۴ء	۲۰	۳
ترقی پسند افسانہ: ایک جائزہ	مصطفیٰ کمال	جولائی، اگست ۱۹۹۰ء	۱۶	۴
ترقی پسند تحریک	تاج پیامی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۳

ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری	لطف الرحمن	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۴
ترقی پسند مارکسی اردو ادبی تحریک کا زوال	ڈاکٹر نسیم ابن صمد	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۳
ترقی پسندی سے جدیدیت تک	مظہر امام	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱
ترک اور چغتائی جمالیات	شکیل الرحمن	جنوری تا مارچ ۱۹۸۷ء	۱۳	۱
تشکیل افسانہ	عبدالمغنی	اپریل تا جون ۱۹۸۸ء	۱۴	۲
تصوف اور آج کے عصری تقاضے	قیوم خضر	جولائی، اگست ۱۹۹۴ء	۲۰	۴
تعلیمی ادب اور ادبی تعلیم	مبین احمد	اکتوبر ۱۹۷۸ء	۴	۱۲
تقاریر سرت چندر چٹرجی	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	اکتوبر ۱۹۷۷ء	۴	۸
تلاش پرویز شاہدی	سلطان آزاد	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۴
تلامذہ کے کلام پر شاد کی اصلاح	ڈاکٹر کلیم سہسرامی	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
تلگو زبان اور ادب	ایم باگا ریڈی	جنوری تا اپریل ۱۹۷۷ء	۴	۶
تنظیم غالبیات پر چند سوالات	ڈاکٹر تارا چرن رستوگی	مئی، جون ۱۹۹۴ء	۲۰	۳
تنقید کا تاثراتی دبستان	ڈاکٹر خورشید سمیع	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
تنقید کی زبان	ابوالفیض سحر	اپریل ۱۹۷۶ء	۲	۲
تنقید کی زبان	افصح ظفر	اپریل ۱۹۷۸ء	۴	۱۰
تھی اس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار (محمد علی جوہر)	محمد حامد علی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴

(ٹ)

ٹی ایس ایلیٹ: تنقید اور جدید شاعری کا بادشاہ	اندر جیت لال	اکتوبر ۱۹۷۶ء	۳	۵

(ج)

جابر حسین: اجنبی تخلیقی فضا کے مظہر	ڈاکٹر علیم اللہ حالی	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
جابر حسین: ایک ذاتی تاثر	رضوان احمد	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
جابر حسین: حساس لمحوں کا شاعر	مشتاق احمد نوری	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
جابر حسین کی نظمیں	انور ایرج	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳

جاں نثار اختر: شخص اور شاعر	سید محمد مظفر	مئی، جون ۱۹۹۶ء	۲۲	۳
جانِ محفل: احمد جمال پاشا کی یاد میں	رام لعل	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۴
جاوید نامہ اور دانتے کی الطربیہ	تارا چرن رستوگی	اکتوبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۰
جدید ادب اور عصری مسائل	ڈاکٹر قدوس جاوید	اکتوبر ۱۹۷۸ء	۴	۱۲
جدید ادب کے محرکات	ڈاکٹر عبدالواسع	اپریل تا جون ۱۹۸۷ء	۱۳	۲
جدید اردو ادب میں جمالیاتی شعور	ظفر ہاشمی	مارچ، اپریل ۱۹۹۵ء	۲۱	۲
جدید اردو افسانے میں احتجاج کی بازگشت	احمد صغیر	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء	۲۵	۴ تا ۶
جدید اردو تنقید اور پیروی مغرب	علی حماد عباسی	ستمبر ۱۹۷۹ء	۵	۹
جدید اردو تنقید میں وہاب اشرفی کے امتیازات	ڈاکٹر لطف الرحمن	مارچ، اپریل ۱۹۹۱ء	۱۷	۲
جدید اردو شاعری: روایت سے بغاوت تک	ڈاکٹر جاوید اختر	مارچ، اپریل ۱۹۹۷ء	۲۳	۲
جدید اردو غزل: روایت اور حقیقت	عاصم شہنواز شبلی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
جدید اردو مثنوی نگاری اور شاد	ڈاکٹر شمیم احمد	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۲/ ۳
جدید افسانہ: ایک مباحثہ (جوگندر پال، شرون کمار ورما، ڈاکٹر نریش)	نثار احمد صدیقی	اکتوبر ۱۹۷۸ء	۴	۱۲
جدید افسانے کے فکری عناصر	شہزاد منظر	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۵
جدید افسانے میں روحانیت اور مادیت کی آویزش	ابوالکلام قاسمی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۶ تا ۱۲
جدید انگریزی شاعری کے رجحانات	ڈاکٹر محمد حنیف	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
جدید ترنسل کی شعری کائنات	معراج رعنا	مارچ، اپریل ۱۹۹۷ء	۲۳	۲
جدید حسیت کی شاعری (جابر حسین)	شفیع مشہدی	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
جدید شاعری اور لفظیات	ابویوسف	اگست ۱۹۸۱ء	۷	۸
جدید عربی ڈراما	متین احمد ابدالی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
جدید فن مصوری	اندر جیت لعل	جنوری ۱۹۷۹ء	۵	۱
جذب گوپال پوری: دبستان بہار کا ایک گمنام شاعر	وفا ملک پوری	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴

جمال مشیت: ایک جائزہ	علیم اللہ حالی	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء	۲۰	۶/۵
جمالیات اور جدید فکری تناظر	ڈاکٹر مرتضیٰ اظہر رضوی	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۵/۴
جمالیات کا ایک دلچسپ پہلو	پروفیسر خورشید سمیع	جون ۱۹۸۰ء	۶	۶
جمالیات کے رجحانات	ڈاکٹر خورشید سمیع	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۵/۴
جمیل سلطانپوری: شمالی بہار کا ایک غیر معروف شاعر	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۵
جمیل مظہری (علامہ) 'فکر جمیل' کے آئینے میں	انور حسین زاہدی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
جمیل مظہری: ایک تحریکی شاعر	مظفر مہدی	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
جمیل مظہری (علامہ) بحیثیت استاد	سید اطہر شیر	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۴
جمیل مظہری: شخصیت اور فن	عبدالخالق	اپریل ۱۹۷۸ء	۴	۱۰
جمیل مظہری کا ایک شعر مہجور شمسی کی نظر میں	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	اپریل تا جون ۱۹۸۹ء	۱۵	۲
جمیل مظہری کا ناولٹ: 'شکست و فتح'	شبیر احمد قیصر	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
جمیل مظہری کی رثائی شاعری	ایس ایم رضوان اللہ	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۴
جمیل مظہری کی رومانی شاعری	رحمن حمیدی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
جمیل مظہری کی شاعری اور ان کا عقیدہ	جمیل ظہیر	جولائی ۱۹۸۰ء	۶	۷
جمیل مظہری کی شخصیت و شاعری	سید رضی الدین احمد	جولائی ۱۹۷۷ء	۴	۷
جمیل مظہری کی مثنوی 'آب و سراب'	محمد سمیع الحق	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
جمیل مظہری کے قصائد	کمال الدین	جنوری تا اپریل ۱۹۷۷ء	۴	۶
جواب گریزاں (ابتدائے زبان کے مسئلے کا ایک تاریخی پس منظر)	عباس عزل	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
جواہر لال نہرو اور اقبال (ہندوستانی ثقافت کے علمبردار)	ڈاکٹر تارا چرن رستوگی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۳
جوشش عظیم آبادی بحیثیت غزل گو	انعام ناظمی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۴
جوش 'قطرہ و قلزم' کے آئینے میں	منصور عمر	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
جوش کی منظری شاعری	ممتاز احمد خاں	جنوری ۱۹۸۰ء	۶	۱

جوش ملیح آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط	صابر کمال	جنوری ۱۹۷۸ء	۴	۹
جوہر نظامی عظیم آبادی	عبدالباقی قاسمی	ستمبر،اکتوبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۵
جھگڑالو بچے: ایک مسئلہ	مناظر عاشق ہرگانوی	نومبر،دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۲/۱۱

(چ)

'چار چہرے': ایک جائزہ	اسلم اعظمی	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
'چار چہرے': فن کی روشنی میں	رضوان احمد خاں	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
'چار چہرے': نفسیاتی تجزیہ	ڈاکٹر محمد محسن	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
چارلس پامر: ایک اردو نواز انگریز	اکمل یزدانی جامعی	اکتوبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۰
'چراغ لالہ' (شمس شیدائی)	پروفیسر کلیم سہسرامی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۴
چکبست پر میری تحقیق: ایک باز دید	کالی داس گپتا رضا	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
چکبست کی قومی اور وطنی شاعری	منظر اعجاز	مارچ،اپریل ۱۹۹۰ء	۱۶	۲
چکبستیات اور کالی داس گپتا رضا	تارا چرن رستوگی	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
چند باتیں (سہیل عظیم آبادی)	قطب شاہین	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
چند ساعت رہیں گے چلے جائیں گے (اطہر نفیس)	ڈاکٹر ارمان نجمی	ستمبر ۱۹۸۱ء	۷	۹
چے خف: اجنبیت اور بے معنویت کا روحانی زلزلہ پیما	نظام صدیقی	جنوری تا اپریل ۱۹۷۷ء	۴	۶
چینی مصوری اور مسلمان فن کار	شکیل الرحمن	اپریل تا جون ۱۹۸۶ء	۱۲	۲
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا (سہیل عظیم آبادی)	شکیلہ اختر	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴

(ح)

حافظ اور اقبال	لطف الرحمن	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء	۲۰	۶/۵
حافظ اور غالب	سید نہال اختر	جنوری ۱۹۷۸ء	۴	۹
حافظ: ناخدای سفینۂ غزل	قمر غفار (علیگ)	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۳

حالی بحیثیت نثر نگار	شاہینہ اسرار احمد	اپریل تا جون ۱۹۸۳ء	۹	۲
حالی کا تنقیدی شعور	رشید الدین	اگست ۱۹۸۱ء	۷	۸
حالی کی ادبی خدمات	عصمت جہاں	جنوری تا مارچ ۱۹۸۷ء	۱۳	۱
حالی کی دریافت: غالب	صالحہ عابد حسین	اپریل تا جون ۱۹۸۴ء	۱۰	۲
حالی کی طنزیہ شاعری	منصور نعمانی ندوی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
حبیب جالب	ڈاکٹر ارتضیٰ رضوی	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۵
حساس لمحوں کا شاعر: جابر حسین	مشتاق احمد نوری	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
حسرت کی شخصیت	مظفر حنفی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
حسرت کے شعری تجربے	محمد سالم	جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء	۱۱	۱
حسرت موہانی کی شاعرانہ انفرادیت	اشفاق احمد	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
حسن بیگ کرامی: ایک تحقیقی مطالعہ	غلام مجتبیٰ انصاری	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
حسنین عظیم آبادی کی انشائیہ نگاری	سید عارف حسنین	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
حضرت امیر خسرو	ڈاکٹر شکیل الرحمن	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۵/۶
حضرت بلھے شاہ	شکیل الرحمن	مئی، جون ۱۹۹۴ء	۲۰	۳
حضرت خواجہ سلطان الہند: ہند میں مسلم معاشرہ کے فروغ کے پیش رو	قیوم خضر	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۵/۶
حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک اور اس کی اہمیت	ڈاکٹر قدسیہ خاتون	مئی ۱۹۸۰ء	۶	۵
حضرت کمال کی مثنوی میں حمد و مناجات	طیب عثمانی ندوی	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
حفیظ جون پوری	سید بدر الدین احمد	جنوری تا اپریل ۱۹۷۷ء	۴	۶
حفیظ جون پوری: معروضات	محسن رضا رضوی	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
حمزہ علی رند	ڈاکٹر سید حسین احمد	اپریل تا جون ۱۹۸۷ء	۱۳	۲
حنا سر ناخن (علیم اللہ حالی سے متعلق اقتباسات)	ادارہ	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء	۱۹	۴ تا ۶
حیات اللہ انصاری کا ادبی سفر	ڈاکٹر جلال اصغر فریدی	جنوری، فروری ۱۹۹۹ء	۲۵	۱

حیات اللہ انصاری کی افسانہ نگاری	مناظر عاشق ہرگانوی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳
حیات اللہ انصاری کی صحافت	رحمن حمیدی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
حیات چکبست کے چند نقوش	خواجہ عبدالغفور	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱

(خ)

خاتم پھرا جے پوری کٹکی کا نعتیہ کلام	شیخ مبین اللہ	اپریل تا جون ۱۹۸۲ء	۸	۲
خدا بخش لائبریری جرنل (۱، ۲، ۳، ۴)	سید حسن، عطا کاکوی	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
خدا بخش اورینٹل لائبریری کے چند نادر نسخے	جوہر نظامی	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
'خدا کی بستی': ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر حامد علی خاں	جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء	۲۲	۲/۱
خسرو کا کلام: صنائع و بدائع کے آئینہ میں	رئیس نعمانی	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
خسرو کی غزل گوئی	طلحہٰ رضوی برق	جولائی ۱۹۷۷ء	۴	۷
خطبات محمد ہدایت اللہ	گوپی چند نارنگ	اپریل تا جون ۱۹۸۳ء	۹	۲
خطوط شاد عظیم آبادی: ایک جائزہ	عبداللطیف اعظمی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء	۹	۴
خطوط غالب میں تاریخی مواد	نثار احمد فاروقی	جولائی ۱۹۷۷ء	۴	۷
خلیل الرحمن اعظمی: خوابوں کا شاعر	محمد سالم	ستمبر ۱۹۷۹ء	۵	۹
خواتین: اہمیت اور مرتبہ	قمر النسا بیگم	جنوری ۱۹۷۹ء	۵	۱
خواجہ حسن نظامی	عطاءاللہ ڈھاکوی	جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء	۲۲	۲/۱
خواجہ حسن نظامی: انشائیہ کے آئینے میں	ذوالفقار علی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
خواجہ حسن نظامی کا اسلوب اور طنز و مزاح	مظفر حنفی	اپریل تا جون ۱۹۸۴ء	۱۰	۲
خواجہ حسن نظامی کا 'لا': ایک مطالعہ	محمد مظاہر الحق	اپریل تا جون ۱۹۸۷ء	۱۳	۲
خواجہ حسن نظامی کی 'مکھی' پر ایک نظر	محمد مظاہر الحق	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے	نثار احمد فاروقی	اپریل ۱۹۷۶ء	۲	۲
خواجہ عبداللہ تائید: حالات زندگی	محمد شہاب الدین	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
خواجہ کا 'الو': ایک مطالعہ	محمد مظاہر الحق	اپریل تا جون ۱۹۸۴ء	۱۰	۲
خودکشی: کیوں؟	انصار احمد	جنوری ۱۹۷۹ء	۵	۱

خوشحال خاں خٹک: اقبال کا پسندیدہ شاعر	آنسہ زہرا عرشی	اکتوبر ۱۹۷۷ء	۴	۸

(د)

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ	کلیم احمد عاجز	نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۶
دبستان ادب کی ترکیب	شعیب عظیم	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
درد کے عہد کا ادبی اور سماجی ماحول	منظر امام	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۵
دشنیت کمار تیاگی: فن کار اور فن	ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن	اکتوبر ۱۹۷۷ء	۴	۸
دکنی ادب کی تدریس اور ادبی تحقیق و تنقید......	ڈاکٹر شکیل الرحمن	مئی، جون ۱۹۹۰ء	۱۶	۳
دل کا کانٹا: ایک کہانی، ایک تجزیہ	شکیب ایاز	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
دلگیر کی مرثیہ گوئی	رضوان احمد خاں	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
'دو بیل سیاسی شکنجے میں' کا خصوصی مطالعہ	معصوم عزیز کاظمی	اگست ۱۹۸۱ء	۷	۸
دوراں: شخص اور شاعر	اسلام پرویز	جولائی ۱۹۷۹ء	۵	۷
دوراں: غم زدوں کا شاعر	محمد سالم	جولائی ۱۹۷۸ء	۵	۱۱
دوراں کی شاعری ('ابابیل' کے آئینے میں)	محمد سالم	جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء	۱۴	۱
'دو گز زمین': ایک مطالعہ	ڈاکٹر سید محمد محسن	مئی، جون ۱۹۹۰ء	۱۶	۳
دو نسلوں کا تصادم	انصار صدیقی	جولائی ۱۹۷۸ء	۵	۱۱
دیوان بیدار کا ایک نادر و نایاب مخطوطہ (نسخہ محمود آباد)	اکبر حیدری کاشمیری	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
دیوان شاد عظیم آبادی کا ایک نادر و نایاب نسخہ	اکبر حیدری کاشمیری	اپریل تا جون ۱۹۸۳ء	۹	۲
دیوداسیاں: تاریخ کی روشنی میں	امتیاز احمد	جولائی ۱۹۷۹ء	۵	۷
دیہات کے بچوں کے مسائل	جی رویندرن نائر	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۲/۱۱

(ڈ)

ڈاکٹر اقبال کی ایک غیر معروف غزل	محمد عبدالقادر احقر	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
ڈاکٹر راجندر پرشاد اور اردو ہندی	تقی رحیم	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳

ڈاکٹر مرتضیٰ اظہر	خواجہ فیاض احمد دربھنگوی	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء	۲۰	۶/۵
ڈراما انارکلی: ایک جائزہ	سید غلام مرتضیٰ	اکتوبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۰
ڈراما نگاری کا فن	ظفر کمالی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۳
ڈنمارک کے شاہی کتب خانے میں اردو کے مخطوطات	خواجہ احمد فاروقی	جنوری ۱۹۷۶ء	۲	۱

(ذ)

ذاکر حسین (ڈاکٹر) سے میری چند ملاقاتیں	ڈاکٹر اقبال حسین	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
ذکر امیر خسرو	ڈاکٹر سید آل ظفر	جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء	۲۲	۲/۱
ذکر ایک منفرد مسلک کا (’روپ‘ کی رباعیاں)	شکیل الرحمن	اپریل تا جون ۱۹۸۸ء	۱۴	۲
ذکر مست کلکتوی	شانتی رنجن بھٹا چاریہ	اپریل تا جون ۱۹۸۷ء	۱۳	۲

(ر)

راجندر سنگھ بیدی: ایک مطالعہ	کہکشاں پروین	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
راجستھانی لوک گاتھائیں	فضل امام	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱
راجندر سنگھ بیدی کا فن	ثوبان فاروقی	جولائی، اگست ۱۹۹۱ء	۱۷	۴
راسخ: قصر شاعری کا ستون راسخ	قیوم خضر	مئی، جون ۱۹۹۰ء	۱۶	۳
راشد کی نظموں کا فکری و فنی تجزیہ	اسلام عشرت	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
راغب اور مکیں	ڈاکٹر کاظم حسین	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۴
راغب کی غزلیں	ڈاکٹر کاظم حسین	جنوری تا مارچ ۱۹۸۶ء	۱۲	۱
راغب (محمد جعفر خاں) کے اسلاف	ڈاکٹر کاظم حسین	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
رام لعل بحیثیت ناقد افسانوی ادب	تارا چرن رستوگی	نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۶
رباعی اور چند دیگر اصناف سخن (ایک تقابلی مطالعہ)	ناوک حمزہ پوری	مئی، جون ۱۹۹۶ء	۲۲	۳

رباعی نگاری روایت ودرایت کے تناظر میں	تاراچرن رستوگی	اپریل تا جون ۱۹۸۴ء	۱۰	۲
رباعیات حافظ شیرازی: ایک مطالعہ	ڈاکٹر تاراچرن رستوگی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴
رباعیات مانوس (سہسرامی)	محمد اشفاق عادل	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۴
رسالہ احوال امیر عطااللہ جعفری زینبی پھلواروی	ڈاکٹر فضیل احمد قادری	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
رشید احمد صدیقی: ایک عظیم اور منفرد خاکہ نگار	سردار احمد	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
رشیدۃ النسا: اردو کی پہلی خاتون ناول نگار	ڈاکٹر ممتاز احمد	مئی، جون ۱۹۹۴ء	۲۰	۳
رشیدۃ النسا: عظیم آباد کی ایک ممتاز خاتون	راشدہ آفتاب	اپریل ۱۹۸۰ء	۶	۴
'رقص بسمل' (شین مظفر پوری)	احمد یوسف	نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۶
رمز عظیم آبادی اور 'نغمہ سنگ'	سید فیاض الرحمن	مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء	۱۶	۲
رمز کی شخصیت اور فن	فیاض الرحمن شارق	جنوری، فروری ۱۹۹۹ء	۲۵	۱
رمزیت اور ایمائیت کے فن کار: رشید احمد صدیقی	شکیل الرحمن	مارچ تا جون ۱۹۹۹ء	۲۵	۲/۳
رنجور عظیم آبادی: ایک مطالعہ	ڈاکٹر ثریا جبیں	جون ۱۹۸۰ء	۶	۶
رنگین کے ریختی کلام کا ایک نادر مخطوطہ	ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۵/۶
رودکی کا احیائے ثانی	ل احمد اکبرآبادی	جولائی ۱۹۷۶ء	۲	۴
روزی روٹی اور اردو	کلیم احمد عاجز	جولائی، اگست ۱۹۹۰ء	۱۶	۴
روشنی کے روزن	ڈاکٹر محمد منصور عالم	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
روشنی کے مینار: پیر جگجوت سید شہاب الدین	سید اطہر شیر	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۴
رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر	سید محمد مصطفیٰ	جنوری ۱۹۸۰ء	۶	۱
ریاض حسن خاں خیال: شخصیت اور شاعری	ڈاکٹر فاروق صدیقی	اپریل ۱۹۸۰ء	۶	۴
ریختی: ایک فراموش کردہ صنف سخن	شمیم احمد صدیقی	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۵/۶
(ز)				
زبان اردو اور قومی یکجہتی	قمر اعظم ہاشمی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴

زبان، معاشرہ اور سیاست	سلیم شہزاد	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
زبان و بیان	رشید حسن خاں	جولائی ۱۹۷۶ء	۲	۴
زبیر الحسن غافل: سنجیدہ ظریفانہ شاعری کا اہم نام	رضا نقوی واہی	جنوری تا جون ۱۹۹۳ء	۱۹	۱ تا ۳
زبیر فاروق کی غزل گوئی	ڈاکٹر وہاب اشرفی	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
زہرا نگاہ کی شاعری	رضوان احمد	نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء	۱۲	۶
زیباشناس: تجزیہ و تفہیم	ڈاکٹر حسین الحق	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۵/۴
زیب غوری کی یاد میں	ڈاکٹر مظفر حنفی	مئی تا اگست ۱۹۹۲ء	۱۸	۴/۳

(س)

ساحر لدھیانوی کا تخلیقی پس منظر	عظیم اقبال	جولائی ۱۹۸۰ء	۶	۷
ساختیات اور اسلوبیات کے تناظر میں نارنگ کا سفر	ڈاکٹر امام اعظم	جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء	۲۲	۲/۱
سائل سہسرامی: بہار کا ایک معمر و گمنام شاعر	حاذق ضیائی سہسرامی	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
سٹی کالج کے مخدوم	اقبال متین	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
سجاد حیدر یلدرم	ڈاکٹر فضیل احمد	جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء	۲۲	۲/۱
سجاد ظہیر: تصور شاعری اور شاعری	ایس ایم عباس	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
سخن ہائے تحقیق	ڈاکٹر محمد منصور عالم	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۴
سراج الدین علی خاں آرزو	سید صابر حسن	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
سرت چندر چٹر جی اور ان کا فن	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	جنوری تا اپریل ۱۹۷۷ء	۴	۶
سرسید احمد خاں اور اکبر الہ آبادی میں معرکہ آرائی	ذوالفقار علی علیگ	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۴
سرسید احمد خاں 'تہذیب الاخلاق' کے آئینہ میں	ذوالفقار علی علیگ	اپریل تا جون ۱۹۸۳ء	۹	۲
سرسید بحیثیت اسلوب نگار	پروفیسر علاء الدین شاہد	ستمبر ۱۹۸۱ء	۷	۹
سرسید تحریک کا پہلا دور	عتیق صدیقی	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی: اغراض ومقاصد، احوال وکوائف	قمرالہدیٰ فریدی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۳
سرگزشت آدم: قرآن کی روشنی میں	محمد بدیع الزماں	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴
سریر: سریر آرائے سخن	قیوم خضر	جولائی، اگست ۱۹۹۱ء	۱۷	۴
سریر کابری (علامہ) اوران کی شاعری	سید احمد قادری	مئی، جون ۱۹۹۱ء	۱۷	۳
سریر کابری کا فکری وفنی رویہ	علیم اللہ حالی	جولائی، اگست ۱۹۹۰ء	۱۶	۴
سعادت یار خاں رنگین اور ریختی	ضیاء الدین اصلاحی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۳
سکھ راج بہادر رحمتی	ڈاکٹر سید حسین احمد	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۳
سلسلہ شطاریہ بہار میں	فضیل احمد قادری	جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء	۱۴	۱
سلطان اختر کی شاعری	ڈاکٹر کمال الدین	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
سلطان اختر کے شعری امتیازات	ڈاکٹر اسلام عشرت	مارچ، اپریل ۱۹۹۷ء	۲۳	۲
سلہٹ کے اردو ادیب	سید یوسف حسن	اپریل تا جون ۱۹۸۴ء	۱۰	۲
سلیم احمد کی شاعری کی معنویت	ڈاکٹر حسن رضا	مئی، جون ۱۹۹۱ء	۱۷	۳
سنسکرت میں ڈراما نگاری کا فن	محمد سمیع الحق	مارچ، اپریل ۱۹۹۵ء	۲۱	۲
سودا کے قصیدے: ایک گمنام شاعر کی مدح میں	عبدالغفار انصاری	مئی ۱۹۸۰ء	۶	۵
سہیل عظیم آبادی	امرت رائے	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی: اپنے ناول کے آئینے میں	رحمن حمیدی	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی اور سیکولرزم	ڈاکٹر طلحہٰ رضوی برق	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
سہیل عظیم آبادی اور انجمن ترقی اردو	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی: ایک تاثر	ڈاکٹر عبدالمنان	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی: ایک ریڈیائی انٹرویو	ڈاکٹر عبدالخالق	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی: ایک مطالعہ	ضیا عظیم آبادی	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی: بحیثیت شاعر	تاج پیامی	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی: پیکر انسانیت	ابوالکلام عزیزی	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی: خوشبو گلاب کی	ڈاکٹر شنکر پرساد	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴

سہیل عظیم آبادی: سرسری نظر میں	شین مظفر پوری	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی: کچھ یادیں	رونق دکنی سیمابی	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی کا اسلوب	ڈاکٹر کمال الدین	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی کا افسانہ 'بھابی جان'	احمد یوسف	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی کا ایک خط بنام شان بھارتی	سہیل عظیم آبادی	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی کا ناول: 'بے جڑ کے پودے'	شین قیصر	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی کی افسانوی فن کاری	ڈاکٹر سید حامد حسین	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری	سید احمد قادری	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری	جمیل ظہیر	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی کی ترقی پسندی	پروفیسر اویس احمد دوراں	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
سہیل عظیم آبادی کی خدمات: مکاتیب کی روشنی میں	اکمل یزدانی جامعی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
سہیل عظیم آبادی کے افسانوں میں طبقاتی شعور	ڈاکٹر شعیب راہی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
سہیل عظیم آبادی کے افسانے	ڈاکٹر محمد حسن	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
سہیل عظیم آبادی کے افسانے ('الاؤ' سے 'چار چہرے' تک)	ڈاکٹر اعجاز علی ارشد	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی کے تین افسانے	نسیم اختر	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی: گنج گراں مایہ	عبدالباقی قاسمی	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی مرحوم اور 'بے جڑ کے پودے'	ڈاکٹر منظر اعظمی	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی مرحوم	کامریڈ تقی رحیم	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہیل عظیم آبادی: میری نظر میں	کامریڈ حبیب الرحمن	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
سہسرام کا اردو اسٹیج	کلیم سہسرامی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳
سہسرام کی ادبی خدمات اور سرگرمیاں	خالد سجاد	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۳
'سیاہ حاشیے': افسانہ یا لطیفہ	ڈاکٹر ظفر سعید	مارچ، اپریل ۱۹۹۷ء	۲۳	۲

'سیاہ حاشیے' اور منٹو کا آرٹ	ڈاکٹر اسلم پرویز	جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء	۲۲	۲/۱
سید ابوظفر محمد یحییٰ واقف بہاری	شاہ مقبول احمد	ستمبر ۱۹۷۹ء	۵	۹
سید امیر حسن ایجاد	بہزاد فاطمی	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء	۱۷	۶/۵
سید سلیمان ندوی	محمد منصور عالم	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء	۱۹	۴ تا ۶
سید سلیمان ندوی بحیثیت ایک شاعر	منصور نعمانی ندوی	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
سید شاہ شرف الدین احمد جوہر شیخ پوروی	عطاء الرحمن ہاشمی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء	۱۱	۱
سید وزیر علی عبرتی: فن اور شخصیت	محمد ابراہیم	جولائی ۱۹۷۷ء	۴	۷
سیموئل بیکٹ: نئے ڈراما کا رہنما	محمد حنیف	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء	۱۷	۶/۵
سے می نار اور بہار	سید محمد حسنین	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴

(ش)

شاد اور مرثیہ	کلیم الدین احمد	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
شاد عظیم آبادی کی غزل گوئی	سید ابوطالب زیدی	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
شاد عظیم آبادی کی ندرت سخن	شاہ فضل امام واقف	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
شاد عظیم آبادی کے ایک مربی: میر سید محمد	ڈاکٹر محمد عزیز الرحمن	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
شاد عظیم آبادی کے شب و روز	بہزاد فاطمی	اپریل تا جون ۱۹۸۶ء	۱۲	۲
شاد عظیم آبادی: لہجے کا شاعر	ڈاکٹر محمد حسن	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
شاد عظیم آبادی: نئی غزل کے پیش رو	مظہر امام	جنوری ۱۹۷۹ء	۵	۱
شاد کا اسلوب نثر	وہاب اشرفی	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
شاد کی اختراعی صلاحیتیں	قاسم صہبا جمیلی	جنوری تا اپریل ۱۹۷۷ء	۴	۶
شاد کی استعاراتی شاعری	جمیل مظہری	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
شاد کی انفرادیت	عطا کاکوی	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
شاد کی شاعری میں قومی یکجہتی اور حب الوطنی	بہزاد فاطمی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
شاد کی غنائیت وجدت	نقی احمد ارشاد	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
شاد کی مرثیہ گوئی	ڈاکٹر قدوس جاوید	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲

شاد کی مرثیہ گوئی	رضوان احمد خاں	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۲/۳
شاد کی مرثیہ نگاری	محمود علی صبا عظیم آبادی	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۲/۳
شاد کی ناول نگاری (اشاعت ثانی، بہ ترمیم واضافہ)	نقی احمد ارشاد	مارچ ۱۹۹۱ء	ندارد	ندارد
شاد معاصرین کی نظر میں (اشاعت ثانی، بہ ترمیم واضافہ)	نقی احمد ارشاد	مارچ ۱۹۹۱ء	ندارد	ندارد
شاعر، انسانیت کی دنیا میں	شاہ فضل امام واقف	اپریل ۱۹۷۸ء	۴	۱۰
شاعر کی شاعری (حمایت علی شاعر)	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء	۱۱	۱
شاعری اور تنقید سے متعلق اقبال کے خیالات	تاراچرن رستوگی	اپریل تا جون ۱۹۸۲ء	۸	۲
شاعری: براہ راست و بالواسطہ	قاضی عبیدالرحمن ہاشمی	اپریل ۱۹۷۶ء	۲	۲
شاعری کا تخلیقی تجزیہ	جمیل ظہیر	اپریل تا جون ۱۹۸۳ء	۹	۲
شاغل فریدی: حیات اور شاعری	ڈاکٹر کلیم سہسرامی	اکتوبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۰
شانتی رنجن بھٹاچاریہ: شخصیت اور فن	عشرت بیتاب	جولائی، اگست ۱۹۹۴ء	۲۰	۴
شاہ امان اللہ قادری: عظیم روایتوں کے امین	فضیل احمد قادری	اپریل تا جون ۱۹۸۷ء	۱۳	۲
شاہ عالم ثانی آفتاب: چندروز پٹنہ میں	عبدالغفار انصاری	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳
شاہ غلام علی قلندر عظیم آبادی: بہار کا ایک گمنام مصنف	مختار الدین احمد	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳
شاہ ولی اللہ کا سیاسی مسلک	خورشید نعمانی ردولوی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
'شاہد رعنا' اور 'امراؤ جان ادا' کی مماثلتیں	شاہد جمیل	جنوری، فروری ۱۹۹۰ء	۱۶	۱
شبلی نعمانی طنز نگار شاعر کی حیثیت سے	منصور نعمانی ندوی	اکتوبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۰
شرف عظیم آبادی اور 'جراثیم ادب'	بہزاد فاطمی	مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء	۱۶	۲
'شعاع جاوید': رباعیات رضا	ڈاکٹر تاراچرن رستوگی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء	۹	۴

شعر اقبال اور سیکولرزم	ڈاکٹر تارا چرن رستوگی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
شعرائے ریختہ کی تذکرہ نگاری کا سال آغاز	محمد منصور عالم	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
'شعرستان' اور واہی	ڈاکٹر سید حسن عباس	جنوری، فروری ۱۹۹۰ء	۱۶	۱
شعر، نثر، آہنگ	قدوس جاوید	جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء	۱۴	۱
شعر شور انگیز (تمہید)	شمس الرحمن فاروقی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
شعر شور انگیز (۱)	شمس الرحمن فاروقی	اپریل تا جون ۱۹۸۳ء	۹	۲
شعر شور انگیز (۲)	شمس الرحمن فاروقی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳
شعر شور انگیز	شمس الرحمن فاروقی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء	۹	۴
شعور کی رو اور اردو ناول	شاہد جمیل	جنوری تا مارچ ۱۹۸۹ء	۱۵	۱
شفاء الملک حکیم حبیب الرحمن اخون زادہ	قدوس صدیقی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
شفیع تمنائی: حیات اور شاعری	ش م عارف ماہر آروی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۴
شفیع مشہدی: فن پارے اور فن کار	علیم اللہ حالی	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۲ء	۱۸	۵/۶
شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری	ظفر حبیب	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
شکیلہ اختر بحیثیت افسانہ نگار	مسز رخسانہ	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۳
شکیلہ اختر: کچھ یادیں، کچھ باتیں	ڈاکٹر قمر جہاں	مارچ، اپریل ۱۹۹۵ء	۲۱	۲
شمالی ہند کی پہلی اردو کتاب	مناظر عاشق ہرگانوی	اکتوبر ۱۹۷۸ء	۴	۱۲
شمالی ہند کی پہلی نثری تصنیف	شیریں زباں شفق	نومبر، دسمبر ۱۹۹۵ء	۲۱	۶
شمس الرحمن فاروقی کا تنقیدی رویہ	علی حماد عباسی	اپریل ۱۹۸۰ء	۶	۴
شمس الرحمن فاروقی اور سرسوتی سمان	پروفیسر اصغر عباس	مارچ، اپریل ۱۹۹۷ء	۲۳	۲
شورش عشق (جعفر خاں راغب کی طویل مثنوی)	کاظم حسین	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
شناخت کی تلاش	انگریزی: کرشن کمار اردو: شیخ سلیم احمد	مئی، جون ۱۹۹۱ء	۱۷	۳

شوق نیموی (علامہ): حیات وخدمات	ڈاکٹر فضیل احمد قادری	اپریل تا جون۱۹۸۹ء	۱۵	۲
شہباز: بہار میں نظم جدید کا بانی	رضوان اللہ ندیم	اپریل۱۹۷۸ء	۴	۱۰
شیام نرائن لال: اردو کا ایک گمنام شاعر	ڈاکٹر آصفہ واسع	اپریل۱۹۸۰ء	۶	۴
شیخ احمد گجراتی: دکن کا ایک عظیم شاعر	منظر اعجاز	مئی، جون۱۹۹۱ء	۱۷	۳
شیخ عبدالقدوس	محمد انصاراللہ	اپریل تا جون ۱۹۸۴ء	۱۰	۲
شیر: ہمارا قومی جانور	اندر جیت لال	جولائی۱۹۷۹ء	۵	۷
شین مظفر پوری کا افسانوی اثاثہ	عظیم اقبال	نومبر، دسمبر۱۹۹۶ء	۲۲	۶
شین مظفر پوری کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر ہمایوں اشرف	نومبر، دسمبر۱۹۹۶ء	۲۲	۶
	(ص)			
صدیق مجیبی: شکست انا کا شاعر	ڈاکٹر طلحہٰ رضوی برق	جنوری تا مارچ۱۹۸۶ء	۱۲	۱
صفی احمد: بہار کا ایک گمنام شاعر	اطہر شیر	جنوری تا مارچ۱۹۸۲ء	۸	۱
صفیہ اختر اور خطوط نویسی	روح افزا عبدالسلام	اکتوبر۱۹۷۹ء	۵	۱۰
صلاح الدین خاموش	ڈاکٹر زبیر احمد قمر	اگست تا دسمبر۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
صنف افسانہ نگاری اور شمس الرحمن فاروقی	ڈاکٹر مظفر مہدی	جنوری، فروری۱۹۹۰ء	۱۶	۱
صوبہ بہار میں اردو نثر کی پہلی کتاب	سید رضی الدین احمد	جولائی۱۹۷۶ء	۲	۴
صوفی 'مچھر': ایک مطالعہ	محمد مظاہر الحق	جولائی تا ستمبر۱۹۸۵ء	۱۱	۳
صوفی منیری اور رخشاں ابدالی	ڈاکٹر علی ابدالی	جنوری تا مارچ۱۹۸۸ء	۱۴	۱
	(ض)			
ضرب الامثال	شمس بدایونی	مارچ، اپریل۱۹۹۰ء	۱۶	۲
ضیا گوالیاری کی شاعری اور شخصیت	ل احمد اکبر آبادی	جولائی۱۹۷۸ء	۵	۱
	(ط)			
طربیے کا تصور اور مظاہر	عتیق اللہ	نومبر، دسمبر۱۹۹۵ء	۲۱	۶
طور (کرشن کمار) کی غزلیہ زرخیزی	نادم بلخی	مارچ تا جون۱۹۹۹ء	۲۵	۲/۳

(ظ)

ظ انصاری اور 'خسرو کا ذہنی سفر': ایک مطالعہ	ایم عالم	جولائی، اگست ۱۹۹۱ء	۱۷	۴
ظرافت: حقیقی اور مصنوعی	لطف الرحمن	جولائی ۱۹۷۸ء	۵	۱۱
ظفر اوگانوی: تعزیتی تاثرات	ڈاکٹر رئیس انور	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۴/۵
ظفر اوگانوی: عصری ادب کی ایک اہم آواز	ڈاکٹر عشرت بیتاب	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۴/۵
ظفر اوگانوی: عکس خیال میں	احمد زین الدین	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۴/۵
ظفر اوگانوی: قیمتی یادیں، گہرے زخم	سید احتشام الدین	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۴/۵
ظفر (بہادر شاہ) کی شاعری اور میں	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۴

(ع)

عاجز قادری	محمد ضمان اللہ ندیم	ستمبر ۱۹۸۱ء	۷	۹
عاشق تو قلندر ہے نہ ہندو نہ مسلماں (نظیر اکبر آبادی)	ڈاکٹر قدوس جاوید	جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء	۱۱	۱
عالمی ادب: ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر تارا چرن رستوگی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳
عام مروجہ اور روزمرہ کے چند فقرے	قیصر ضحیٰ عالم	اگست ۱۹۸۱ء	۷	۸
عبدالحق بحیثیت تنقید نگار	ڈاکٹر وجیب الرحمن	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۳
عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر	مناظر عاشق ہرگانوی	جنوری، فروری ۱۹۹۰ء	۱۲	۱
عبدالغفور شہباز بحیثیت نثر نگار	ڈاکٹر عبدالخالق	اکتوبر ۱۹۷۶ء	۳	۵
عبدالغفور شہباز: 'زندگانی بے نظیر' کی روشنی میں	سید محمد حسنین	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء	۹	۴
عبدالغفور شہباز کی نظم نگاری	محمد اعظم الحق داؤدی	جون ۱۹۸۰ء	۶	۶
عبدالماجد دریابادی: ایک حقیقت پسند ڈرامانگار	ڈاکٹر کوثر دلشاد	جنوری تا مارچ ۱۹۸۹ء	۱۵	۱
عبدالمالک آروی (ادیب الملک)	ڈاکٹر طلحہ رضوی برق	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳
عبدالمجید زیبا: ایک گمنام شاعر	تمنا مظفر پوری	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
عبدالمغنی: تنقیدی نظریہ و عمل کا واضح نقطہ	ڈاکٹر شاداب رضی	مئی، جون ۱۹۹۰ء	۱۲	۳
عبدالودود بسمل دربھنگوی	کمال الدین	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴

عربی آزاد نظم کا ارتقا	نثار احمد صدیقی	اگست ۱۹۸۱ء	۷	۸
عربی ادب میں کہانیاں، قصے، حکایات اور مقامات	متین احمد ابدالی	جنوری ۱۹۸۰ء	۶	۱
عروج قادری بحیثیت شاعر	محمد فاروق اعظم	مئی، جون ۱۹۹۶ء	۲۲	۳
عسکری کا تصور روایت	شہزاد منظر	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء	۱۷	۶/۵
عسکری کا تصور روایت اور ادب	شہزاد منظر	نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۶
عسکری کا فکری ارتقا	شہزاد منظر	اپریل تا جون ۱۹۸۹ء	۱۵	۲
عشق ہر شخص کے بس کا نہیں......	ڈاکٹر کلیم عاجز	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
عظیم آباد: اردو شعرا کا مسکن	ڈاکٹر عبدالغفار انصاری	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳
عظیم آباد اور حفیظ جونپوری	طفیل احمد انصاری	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴
عظیم آباد کا ایک گمنام شاعر: صبغت اللہ صبغت	مناظر عاشق ہرگانوی	جنوری ۱۹۷۸ء	۴	۹
عظیم آباد کے مضافاتی شعرا	ڈاکٹر سید شاہد اقبال	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
'عکس': فن و تنقید کا باطن نامہ	پروفیسر طارق سعید	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
علامت اور منٹو کا افسانہ 'پھندنے'	وہاب اشرفی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
علامت نگاری	ڈاکٹر خورشید سمیع	جولائی، اگست ۱۹۹۴ء	۲۰	۴
علامہ اقبال اور جنگ آزادی ہندوستان	عبدالغفار انصاری	جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء	۱۱	۱
علامہ اقبال کا ایک شعر (خودی کو کر بلند اتنا)	انیس امام	جنوری تا مارچ ۱۹۸۶ء	۱۲	۱
علامہ (جمیل مظہری) کی خود فراموشی	انیس امام	جون ۱۹۸۰ء	۶	۶
علم الحدیث	محمد انوار الحق تبسم	اپریل ۱۹۸۰ء	۶	۴
علم و ادب اور زبان اردو کا ایک موتی: عطا حسین والی ریاست کھگڑہ	اکمل یزدانی جامعی	اپریل تا جون ۱۹۸۲ء	۸	۲
علی برادران کے دو خطوط	رئیس الدین فریدی	اکتوبر ۱۹۷۸ء	۴	۱۲
علی گڑھ تحریک کا اردو ادب پر اثر	قمر اعظم ہاشمی	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
علی گڑھ کالج اور مذہبی تعلیمی رواداری	شاد عظیم آبادی	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
علیم اللہ حالی: ایک نظر میں	مشتاق احمد نوری	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء	۱۹	۴ تا ۶

علیم اللہ حالی کی شاعری	ساجدہ زیدی	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء	۱۹	۴ تا ۶
عمل تحقیق کی قاضی عبدالودودی روایت	ڈاکٹر محمد محسن	جنوری تا اپریل ۱۹۹۲ء	۱۸	۲/۱
عنایت خاں راسخ	ڈاکٹر کاظم حسین	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
عندلیب شادانی: شاعر مہتاب	افتخار اجمل شاہین	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
عندلیب شادانی کی غزل گوئی	افتخار اجمل شاہین	اپریل تا جون ۱۹۸۲ء	۸	۲
عود ہندی: غالب کے اردو خطوں کا پہلا مجموعہ	سید معین الرحمن	اکتوبر ۱۹۷۶ء	۳	۵
عورتوں کے حقوق (سرسید کے مضمون کی روشنی میں)	نفیس بانو	جنوری تا مارچ ۱۹۸۲ء	۸	۱
عہد اورنگ زیب اور اس کے بعد ہندوستان کا فارسی شعری ادب	غلام مجتبیٰ انصاری	جنوری ۱۹۷۸ء	۴	۹
عہد صفویہ اور مغلیہ کا ایک گمنام شاعر: شاپور طہرانی	محمد یٰسین انصاری	جنوری ۱۹۷۸ء	۴	۹
عہد غالب کی فکری صورت حال	عتیق احمد صدیقی	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء	۱۷	۶/۵
عہد مغلیہ کا تعلیمی نظام	ڈاکٹر غلام مجتبیٰ انصاری	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
عہد مغلیہ کے شعرا جنھیں انعامات واکرامات سے نوازا گیا	محمود علی صبا عظیم آبادی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳

(غ)

غالب اور فن قصیدہ	محمد توقیر خاں	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
غالب شاعر اور سائنسی نابغہ	محمد مستقیم	جنوری، فروری ۱۹۹۷ء	۲۳	۱
غالب: فارسی شاعری کا ایک اجنبی کردار	ڈاکٹر لطف الرحمن	مئی، جون ۱۹۹۴ء	۲۰	۳
غالب کا مطالعہ: غیر ممالک میں	نند کشور وکرم	اکتوبر ۱۹۷۷ء	۴	۸
غالب کی انفرادیت	رونق زیدی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
غالب کی بنیادی فکر	ڈاکٹر منصور عالم	نومبر، دسمبر ۱۹۹۵ء	۲۱	۶
غالب کی پیکر تراشی	سید غلام سمنانی	جولائی ۱۹۷۷ء	۴	۷

غالب کی شاعری کا ایک ناتراشیدہ پہلو	م ح امام	مئی، جون ۱۹۹۶ء	۲۲	۳
غالب کی شعریات اور نیاذہن	پروفیسر وہاب اشرفی	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
غالب کی شوخیاں	محمد سالم	جنوری ۱۹۷۹ء	۵	۱
غالب کے ایک مربی: علامہ فضل حق خیرآبادی	فاروق احمد صدیقی	جنوری، فروری ۱۹۹۹ء	۲۵	۱
غالب کے آئینے میں آئنسٹائن	محمد مستقیم	جنوری تا جون ۱۹۹۳ء	۱۹	۱ تا ۳
غالب کے کلام میں شوخی کا عنصر	ڈاکٹر مظفر حنفی	مئی، جون ۱۹۹۱ء	۱۷	۳
غالب گم گشتہ	فیاض عالم ولی اللہی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۳
’غبار خاطر‘ اور انانیتی ادب	قدسیہ خاتون	اگست ۱۹۸۱ء	۷	۸
’غبار خاطر‘ میں مولانا آزاد کی رومانیت	ڈاکٹر خلیل احمد	جنوری، فروری ۱۹۹۷ء	۲۳	۱
غربت کی اقتصادیات میں بچوں کا مستقبل	ندیم محسن	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
غزل سودا کے نئے جائزے کی ضرورت	عتیق احمد صدیقی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
غزل کا علامتی اظہار: ایک مطالعہ، ایک جائزہ	نثار احمد	جنوری تا مارچ ۱۹۸۹ء	۱۵	۱
غزل کا مطالعہ (موضوعات کے زاویہ نگاہ سے)	اختر انصاری	اپریل ۱۹۷۶ء	۲	۲
غزل کا نیا لب ولہجہ، آہنگ اور مزاج	راشدہ خانم	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
غزل کے اسلوبی ارتقا میں شاد کا حصہ	لطف الرحمن	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۲/۳
غزلوں میں قصیدے کا آہنگ	ڈاکٹر بدرالنسا شہاب	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴
غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید)	عطا کاکوی	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید-۲)	عطا کاکوی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳
غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید-۳)	عطا کاکوی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۶ء	۱۲	۱
غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید-۴)	عطا کاکوی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۴
غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید-۵)	عطا کاکوی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۷ء	۱۳	۱
غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید-۶)	عطا کاکوی	اپریل تا جون ۱۹۸۷ء	۱۳	۲
غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید-۷)	عطا کاکوی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۳
غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید-۸)	عطا کاکوی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۴
غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید-۹)	عطا کاکوی	اپریل تا جون ۱۹۸۸ء	۱۴	۲

غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید-۱۰)	عطا کاکوی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۳
غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید-۱۱)	عطا کاکوی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۹ء	۱۵	۱
غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید-۱۲)	عطا کاکوی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۳
غلطیہائے مضامین (سلسلہ جدید-۱۳)	عطا کاکوی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
غم کے شاعر: میر	اشرف مولانگری	اپریل تا جون ۱۹۸۸ء	۱۴	۲
غیاث احمد گدی کا فن ('پرندہ پکڑنے والی گاڑی' کی روشنی میں)	عبدالقیوم ابدالی	جولائی ۱۹۷۹ء	۵	۷
	(ف)			
فارسی ادب میں مغل شہزادیوں کا حصہ	منظر امام	اپریل تا جون ۱۹۸۸ء	۱۴	۲
فارسی کی قدیم زبان: بخامنشی اور اوستا	عطیہ اشرف	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴
فارسی کے ہندو شعرا	ش م عارف ماہر آروی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
'فائر ایریا': ایک جائزہ	ڈاکٹر محمد حامد علی خاں	مارچ، اپریل ۱۹۹۷ء	۲۳	۲
'فتح نامہ' (مثنوی)	کاظم حسین	اپریل تا جون ۱۹۸۶ء	۱۲	۲
فراق: اپنے تصور نقد و نظر کے آئینے میں	سید احمد شمیم	اپریل ۱۹۸۰ء	۶	۴
فراق گورکھپوری کی رباعیاں	تاراچرن رستوگی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
فرد پھلواروی: ایک برگزیدہ صوفی شاعر	رضوان اللہ آروی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
'فسانۂ آزاد' کا ایک مختصر تجزیہ	صالحہ عابد حسین	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳
فصیح الدین بلخی کا طرز و اسلوب	ڈاکٹر شعیب راہی	اکتوبر ۱۹۷۷ء	۴	۸
فصیح الملک داغ اور 'اودھ پنچ'	کے ڈی رضا گپتا	جولائی ۱۹۷۶ء	۲	۴
فضا ابن فیضی: ایک مطالعہ	نجم الدین شکیب	جولائی ۱۹۷۶ء	۲	۴
فضا ابن فیضی: بحیثیت غزل گو	محمود الحسن	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۳
فکر اقبال اور مخدوم جہاں شرف الدین یحییٰ منیری	حسین آرزو	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۵
فکر بلیغ	ڈاکٹر محمد منصور عالم	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۲/۳

فلسفۂ عجم (اقبال کا پی ایچ ڈی کا تھیسس)	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۴
فن اور ارتفاعی جنسیت	خورشید سمیع	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء	۱۷	۶/۵
فن تحریر کا آغاز اور قدیم ایران کا رسم خط	نور الاسلام صدیقی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
فن، حسن اور فنی فعلیت	ہربرٹ ریڈ ترجمہ: افسر آذر	مئی تا اگست ۱۹۹۲ء	۱۸	۴/۳
فن خطاطی: ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے میں	ابوبکر قاسمی	نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۶
فن، فکر اور کرشن چندر	ڈاکٹر سید نثار مصطفیٰ	جنوری ۱۹۷۸ء	۴	۹
فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات	رشید الدین	اکتوبر ۱۹۷۸ء	۴	۱۲
فیض: اپنی نمائندہ سیاسی نظموں کے پس منظر میں	اویس احمد دوراں	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
فیض کی تنقید	مظہر امام	جنوری تا مارچ ۱۹۸۶ء	۱۲	۱
فیض کی شاعری میں محبوب کا تصور	رعنا اقبال	جنوری، فروری ۱۹۹۹ء	۲۵	۱
فیض کی نظمیں اور پیکر تراشی	جمشید قمر	جون ۱۹۸۰ء	۶	۶
فیض کے خطوط	شہزاد منظر	اگست ۱۹۷۹ء	۵	۸
فیض: 'نقش فریادی' سے 'میرے دل میرے مسافر' تک	قمر جہاں	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴

(ق)

قاضی عبدالودود: اپنے گھر میں	سید اطہر شیر	مئی، جون ۱۹۹۰ء	۱۶	۳
قاضی عبدالودود اور گیان چند جین	ڈاکٹر ظفر کمالی	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۵ء	۲۱	۵/۴
قاضی عبدالودود کا خودنوشت سوانحی خاکہ: ایک جائزہ	ڈاکٹر محمد محسن	مارچ، اپریل ۱۹۹۵ء	۲۱	۲
قاضی عبدالودود کی ایک حذف شدہ تحریر	شائستہ خاں	جنوری تا مارچ ۱۹۸۹ء	۱۵	۱
قاضی نذر الاسلام: ایک نامور بنگالی شاعر	ڈاکٹر محمد شمس الحق شمس	اگست ۱۹۷۹ء	۵	۸
قتیل دانا پوری کی شاعری	ڈاکٹر محمد منصور عالم	جنوری ۱۹۷۸ء	۴	۹

قدیم معیار نقد اور اردو تذکرے	غضنفر علی غضنفر	جولائی ۱۹۷۷ء	۴	۷
قصہ اردو زبان کا	گوپی چند نارنگ	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱
'قصہ مہر افروز و دلبر' کا مصنف کون؟	محبوب اقبال	مئی، جون ۱۹۹۰ء	۱۶	۳
قوم، قومیت اور قیادت (سرسید تحریک کی روشنی میں)	ڈاکٹر شاہد احمد شعیب	نومبر، دسمبر ۱۹۹۵ء	۲۱	۶
قومی پلان اور پالیسی کا مختصر خاکہ	قمر النسا بیگم	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱ تا ۱۲
قومی زندگی میں صحافت کا کردار	مظفر احمد مہدی	جولائی ۱۹۸۰ء	۶	۷
قومی یکجہتی اور اردو	علی جواد زیدی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
قومی یکجہتی اور اردو ادب	طلحہٰ رضوی برق	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
قومی یکجہتی اور اردو ادب	سید احمد قادری	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
قومی یکجہتی اور اردو زبان	محمد محسن	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
قومی یکجہتی اور اردو شاعری	ظہیر احمد صدیقی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
قومی یکجہتی میں اردو کا حصہ	قیوم خضر	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
قومی یکجہتی میں اردو کا حصہ	طلعت حسین نقوی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
قومی یکجہتی میں بنگال کے اردو ادب کا حصہ	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴

(ک)

'کار جہاں دراز ہے': ایک جائزہ	جمیل ظہیر	اکتوبر ۱۹۷۸ء	۴	۱۲
کالی داس: بحیثیت فلسفی	طارق سعید	اپریل ۱۹۷۹ء	۵	۴
کائنات: بدلتے ہوئے نظریات	اندر جیت لال	اکتوبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۰
'کاشف الحقائق': ایک مطالعہ اور وہاب اشرفی	سید محمد ظفر	نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۶
کپڑوں کے ناموں کی داستان	ڈاکٹر سید حامد حسین	مئی تا اگست ۱۹۹۲ء	۱۸	۳/۴
کتاب سے شغف اور استاد کا احترام	جگن ناتھ آزاد	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۳
کتاب 'عہد رسالت و خلافت راشدہ' پر ایک نظر	شاہ محمد عثمانی	اپریل تا جون ۱۹۸۹ء	۱۵	۲
کچھ تذکرہ نادر کے بارے میں	کاظم علی خاں	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲

کچھ تمہید شعر شور انگیز کے بارے میں	یوسف سرمست	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
کرافٹ اسٹوری	شہزاد منظر	جنوری تا اپریل ۱۹۷۷ء	۴	۶
کرشن چندر کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر حامد چھپروی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
کرشن چندر کی کردار نگاری	اسلم آزاد	اپریل ۱۹۷۸ء	۴	۱۰
کرۂ ارض پر زندگی کیسے شروع ہوئی	اندرجیت لال	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
'کس کی کہانی' (کلام حیدری): ایک نامیاتی مطالعہ	علی امام	مئی، جون ۱۹۹۶ء	۲۲	۳
کشمیری ادب: ایک مختصر سا جائزہ	مہر غلام رسول نازکی	اکتوبر ۱۹۷۶ء	۳	۵
کشمیری میگزین	جگن ناتھ آزاد	جنوری ۱۹۷۸ء	۴	۹
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی	ش م عارف ماہر آروی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۳
کلاسیکی قدر اور ترقی پسند فکر کی ہم آہنگی کی ایک مثال	حسین الحق	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۴
کلام اقبال: ایک بازیافت	عبدالقادر احقر	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
کلام اقبال میں تعمیر سیرت کے لوازم	ظفر حبیب	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
کلام حیدری بحیثیت افسانہ نگار	سید احتشام الدین	مارچ، اپریل ۱۹۹۷ء	۲۳	۲
کلام حیدری کے افسانوں میں عورت	ڈاکٹر عبدالواسع	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
کلام شاد اور تعین زمانہ	ڈاکٹر محمد ذکی الحق	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۲/۳
کلام غالب میں تصوف کی جھلکیاں	شفیع عالم	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
کلکتہ کی اسٹیجی روایات اور ڈرامے	قمر اعظم ہاشمی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۳
کلیات مکاتیب اقبال	تاراچرن رستوگی	جنوری، فروری ۱۹۹۹ء	۲۵	۱
کلیم الدین احمد پر ایک نظر	محمد سالم	جولائی ۱۹۸۱ء	۷	۷
کلیم الدین احمد: چند جھلکیاں	ظفر حمیدی	اپریل تا جون ۱۹۸۴ء	۱۰	۲
کلیم الدین احمد کی تنقیدی بصیرت	سید احمد شمیم	مئی، جون ۱۹۹۰ء	۱۶	۳
کلیم الدین احمد کی تنقید نگاری	ظفر حبیب	جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء	۱۰	۱
کلیم عاجز اور ان کا فن	ڈاکٹر ممتاز احمد	جون ۱۹۸۰ء	۶	۶

کنڑ زبان اور ادب	مجیب الرحمن	جنوری ۱۹۷۶ء	۲	۱
'کوبہ کو' (سلمان اختر): تلاش و تجزیہ	جمال اویسی	مئی، جون ۱۹۹۶ء	۲۲	۳
کوثر خیر آبادی کا شہر گیا میں قیام	ڈاکٹر سید شاہد اقبال	جنوری تا مارچ ۱۹۸۹ء	۱۵	۱
کئی باتیں: حرمت الاکرام کے بارے میں	قطب شاہین	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳
کیا جنگ سے نجات ہے؟	شمشاد حسین	اپریل تا جون ۱۹۸۳ء	۹	۲
کیا ہم بھی بچے ہیں	قمر النسا بیگم	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
کھڑی بولی کا ایک مرثیہ گو: محمد علی سکندر	سید علی عباس	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
کھیل، بچہ اور تعلیم	ڈاکٹر قدوس جاوید	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲

(گ)

گاندھی اور نہرو کا شارح: ڈاکٹر سید عابد حسین	رشید احمد	اپریل تا جون ۱۹۸۴ء	۱۰	۲
گاہے گاہے باز خواں: نذرل کے 'منظوم عم پارہ' کا پس منظر	بنگلہ: محفوظ الرحمن خاں اردو: قاضی محی الدین	اپریل ۱۹۸۰ء	۶	۴
گجرات میں اردو کے دو بہاری خادم علم و ادب	سید شاہد اقبال	جولائی، اگست ۱۹۹۰ء	۱۶	۴
گستاخ گیاوی	تمنا مظفر پوری	مئی، جون ۱۹۹۰ء	۱۶	۳
گلدستۂ جیل	تمنا مظفر پوری	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
گوپی چند نارنگ کے تنقیدی رویے	ابوالکلام قاسمی	جنوری، فروری ۱۹۹۷ء	۲۳	۱
گوہر نایاب (نایاب عظیم آبادی)	محمد عبدالقادر احقر	جولائی ۱۹۸۰ء	۶	۷
'گھاس میں تتلیاں' (وزیر آغا): ایک مطالعہ	ڈاکٹر شمس الحسن	اپریل تا جون ۱۹۸۸ء	۱۴	۲
'گھروندا' کا تنقیدی مطالعہ	رحمن حمیدی	اپریل تا جون ۱۹۸۴ء	۱۰	۲
'گئودان' اور 'چھ مان آٹھ گھنٹہ'	ڈاکٹر شیخ مبین اللہ	نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۶
'گئودان': طبقاتی کشمکش کی روشنی میں	ڈاکٹر شعیب راہی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲

(ل)

لالہ کیول رام ہوشیار اور رسالہ شمع عرفان (قسط اول)	کالی داس گپتا رضا	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳

لالہ کیول رام ہوشیار اور رسالہ شمع عرفان (قسط دوم)	کالی داس گپتا رضا	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء	۹	۴
لالہ کیول رام ہوشیار اور رسالہ شمع عرفان	کالی داس گپتا رضا	جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء	۱۰	۱
لسانی مغالطے	ایم عزیز الحسن	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
لسانی منظر نامہ	عتیق احمد صدیقی	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۵ء	۲۱	۵/۴
لطف الرحمن کی غزل گوئی	محمد اظہر علی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۹ء	۱۵	۱
لفظ اور اس کا تصرفاتی عمل	ساحل احمد	اپریل ۱۹۷۸ء	۴	۱۰
لفظ قرطبہ کی لفظی تحقیق	فیضان عزیزی	اپریل تا جون ۱۹۸۷ء	۱۳	۲
لفظ و معنی کا رشتہ ('مقدمہ شعر و شاعری' کی روشنی میں)	کہکشاں یاسمین	جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء	۱۱	۱
لکھنؤ اسکول اور بہار	ڈاکٹر حمیرا خاتون	ستمبر ۱۹۸۱ء	۷	۹
لوک کہانیاں اور بچے	اعجاز علی ارشد	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۲/۱۱
لہو کے پھول: ایک مطالعہ	عبد المغنی	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱
	(م)			
مارکسیت اور وجودیت کا تقابلی جائزہ	لطف الرحمن	اپریل تا جون ۱۹۸۲ء	۸	۲
'ماسوا': ظہیر صدیقی	علی امام	جنوری ۱۹۷۹ء	۵	۱
مانوس سہسرامی: ناکام محبت کا شاعر	تاج پیامی	اپریل تا جون ۱۹۸۲ء	۸	۲
مانی	شکیل الرحمن	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۴
ماہنامہ 'خاور' ڈھاکا: ایک تفصیلی جائزہ	شعیب عظیم	اپریل تا جون ۱۹۸۳ء	۹	۲
مبارک عظیم آبادی (قسط اول)	نادم بلخی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۳
مبارک عظیم آبادی (قسط دوم)	نادم بلخی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۴
مت سہل ہمیں جانو (سہیل عظیم آبادی)	عبد الصمد	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
'مٹی کا تیل' (خواجہ حسن نظامی): ایک مطالعہ	محمد مظاہر الحق	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۴
مٹھی بھر افسانے، چٹکی بھر تنقید	منظر اعجاز	جنوری، فروری ۱۹۹۹ء	۲۵	۱

مثنوی ‘دستور النصیحت’: ایک گمنام مثنوی	ملکہ خورشید	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
مثنوی ‘زہر عشق’ اور اس کے کردار	رئیس الحق ملک	اپریل تا جون ۱۹۸۶ء	۱۲	۲
مثنوی ‘سحر البیان’ اور اس کی کردار نگاری	اشرف مولانگری	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
مثنوی ‘کتھارنگ’ از قاضی احمد تاج	ڈاکٹر طلحہ رضوی برق	اپریل تا جون ۱۹۸۸ء	۱۴	۲
مثنوی کے ایک پرانے ہیرو کی بازیافت	ڈاکٹر فصیح ظفر	جولائی ۱۹۷۷ء	۴	۷
مثنوی ‘گلزار نسیم’ کا تنقیدی جائزہ	ایم ایچ نیر	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۵/۶
مثنوی ‘مادر ہند’ (شاد نمبر، اشاعت ثانی، بہ ترمیم واضافہ)	بہزاد فاطمی	مارچ ۱۹۹۱ء	ندارد	ندارد
مثنوی ‘ماہ پیکر’ کا مصنف: جدید تحقیق کی روشنی میں	ڈاکٹر نور السعید اختر	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
مثنوی ‘نو بہار عشق’: گلدستہ نصیحت	ملکہ خورشید	اپریل تا جون ۱۹۸۴ء	۱۰	۲
مجروح اور فائر ایریا	منظر اعجاز	جنوری، فروری ۱۹۹۷ء	۲۳	۱
مجروح سلطان پوری کی شاعری	شمس الرحمن فاروقی	نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۶
محب وطن اقبال: ایک مطالعہ وتجزیہ	عبدالمغنی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۶ء	۱۲	۱
محسن اور ان کے افسانے	رضوان احمد خاں	جولائی ۱۹۷۷ء	۴	۷
محسن دربھنگوی: ایک قیمتی ورثہ	ظہیر ناشاد دربھنگوی	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
محقق اعظم قاضی عبدالودود	ایم عالم	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
محمد حسن عسکری	شہزاد منظر	مارچ تا جون ۱۹۹۹ء	۲۵	۲/۳
محمد حسن عسکری کی تاثراتی تنقید	اظہار خضر	اپریل تا جون ۱۹۸۸ء	۱۴	۲
محمد حسن عسکری کی تنقید نگاری	سید تنویر حسین	جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء	۲۲	۱/۲
محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد	ڈاکٹر عبدالخالق	اکتوبر ۱۹۷۷ء	۴	۸
محمد علی جوہر: برصغیر کا گوہر	عطاء اللہ ڈھاکوی	جنوری تا جون ۱۹۹۳ء	۱۹	۱ تا ۳
محمد علی جوہر: اقبال کا مرد قلندر	حسام الدین انظار	اگست ۱۹۷۹ء	۵	۸
محمد فضل الرحمن	ڈاکٹر محمد منصور عالم	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
محمد محسن ‘انوکھی مسکراہٹ’ کے جھروکے سے	ایم عالم	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۵/۶

محمد نقوش: نقش جاوداں	رضوان اللہ آروی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۳
مختار ہاشمی کی غزل	اختر انصاری	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱
مخدوم: ایک شاعر	قدوس جاوید	اپریل تا جون ۱۹۸۴ء	۱۰	۲
مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات	غلام مجتبیٰ انصاری	مئی ۱۹۸۰ء	۶	۵
مخدوم کی شاعری	منصور صدیقی بندھولوی	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
مخمور سعیدی کی شاعری	محمد شاہد پٹھان	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء	۲۵	۴ تا ۶
مخمور سعیدی کی شعری کائنات	زاہدہ زیدی	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۲ء	۱۸	۶/۵
مرأۃ شاد عظیم آبادی	ڈاکٹر محمد قیس مسرت	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
مراثی دبیر	ایس اے صدیقی	اگست ۱۹۷۹ء	۵	۸
مرتضیٰ اظہر رضوی کی مرثیہ گوئی	ڈاکٹر سید حسن عباس	مارچ تا جون ۱۹۹۹ء	۲۵	۳/۲
مرتضیٰ چچا	محسن رضا رضوی	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء	۲۰	۶/۵
مرتضیٰ شیر رضوی کی فارسی صوفیانہ شاعری	اطہر شیر	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
مرزا احمد علی شوق قدوائی اور ان کی شاعری	محمد اعظم الحق داؤدی	ستمبر ۱۹۸۱ء	۷	۹
مرزا رسوا اور ان کی ناول نویسی کا محرک	محمد مظاہر الحق	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
مرزا رسوا کے ناول 'شریف زادہ' میں تنقیدی شعور	پروفیسر ممتاز احمد	جنوری، فروری ۱۹۹۹ء	۲۵	۱
مرزا مظہر جان جاناں کی صوفیانہ شاعری	ڈاکٹر سید صابر حسین	جولائی، اگست ۱۹۹۰ء	۱۲	۴
مرزا غالب کی فارسی غزل گوئی	ڈاکٹر محمد ابوالمظفر	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۰ء	۱۲	۵
'مرصع حلم' (از: وقار حلم) کا تجزیاتی مطالعہ	ظہیر غازی پوری	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۵/۴
مسدس 'بوستاں': انیسویں صدی کا مخطوطہ	فیاض عالم ولی اللّٰہی	جنوری تا جون ۱۹۹۳ء	۱۹	۱ تا ۳
مسلم خواتین کی تعلیم میں مساجد کا حصہ	سید اطہر شیر	اپریل تا جون ۱۹۸۳ء	۹	۲
مشاہیر کے خطوط سہیل عظیم آبادی کے نام	ادارہ	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
مشتری کے خطوط عبدالغفور نساخ کے نام	ڈاکٹر حمیرا خاتون	جنوری، فروری ۱۹۹۰ء	۱۲	۱
مشرقی بنگال میں اردو ڈرامے کا پس منظر	کلیم سہسرامی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۷ء	۱۳	۱
مصحفی کی غزل گوئی	فخر الاسلام اعظمی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳

مصوتوں کی درجہ بندی کا مغالطہ	ایم عزیز الحسن	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳
مضطر خیرآبادی	ڈاکٹر خلیل اللہ خاں	مارچ، اپریل ۱۹۹۱ء	۱۷	۲
مضطر (عبدالمجید) کی شاعری پر ایک نظر	شاہینہ اسرار احمد	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
مطالعۂ جمیل	ظفر حبیب	جولائی، اگست ۱۹۹۰ء	۱۶	۴
مظفر حسین: جمالیات کا ایک اہم ناقد	اظہار خضر	جنوری، فروری ۱۹۹۰ء	۱۶	۱
مظہر امام: ایک بالیدہ فن کار	سید احمد قادری	جنوری تا مارچ ۱۹۸۹ء	۱۵	۱
مظہر امام کا فن کارانہ مرتبہ	ڈاکٹر امام اعظم	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۵
مظہر امام کی غزل	شکیل الرحمن	جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء	۲۲	۲/۱
معذور بچے	ڈاکٹر ایچ اے عثمانی	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۲/۱۱
معراج نامہ	اقبال بلگرامی	اگست تا دسمبر ۱۹۸۰ء	۶	۸ تا ۱۲
مغربی ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حنیف	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
مغربی بنگال میں اردو تذکرہ نگاری	ڈاکٹر عبدالمنان	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
مغلیہ تہذیب زندۂ جاوید ہے	تاراچرن رستوگی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
مغلیہ دور کے چند فارسی شعرا	ش م عارف ماہر آروی	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء	۲۵	۴ تا ۶
'مفہوم کی سمت' پر ایک نظر	محمد سالم	مارچ، اپریل ۱۹۹۵ء	۲۱	۲
مکاتیب داغ	عتیق احمد صدیقی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء	۱۱	۱
مکاتیب قاضی عبدالودود بنام سید انیس شاہ جیلانی	مختارالدین احمد	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۵
مکالمات اقبال	ڈاکٹر محمد منصور عالم	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۳
مکتوبات شاد بنام معاصرین	شاد عظیم آبادی	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
مکتوبات شاد عظیم آبادی	قاضی عبدالودود	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء	۹	۴
مکتوبات شہباز (سید ابو محمد کے نام)	صابر حسن	جنوری ۱۹۷۶ء	۲	۱
مکتوبات معاصرین بنام شاد عظیم آبادی	معاصرین شاد	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
مکمل آزادی کا نعرہ لگانے والی پہلی ہندوستانی خاتون: نشاط النسا بیگم	تقی رحیم (ہندی) مشتاق عظیم (اردو)	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء	۲۵	۴ تا ۶
ملک کی تعمیر میں بچوں کا کردار	اشرف مولانگری	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۲/۱۱

ممتاز شیریں: ایک مطالعہ	محمد اسلم ملک	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
منتخب بے بدل	پروفیسر اختر قادری	اکتوبر ۱۹۷۶ء	۳	۵
منٹو: فکر و فن کے چند پہلو	برج پریمی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
منٹو کا افسانوی پیش و پس	ڈاکٹر صادق	جولائی ۱۹۸۰ء	۶	۷
منٹو کا خاندان	ڈاکٹر برج پریمی	مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء	۱۶	۲
منٹو کا فن	عقیل احمد	اپریل ۱۹۷۹ء	۵	۴
منڈاری زبان کی ایک طویل نظم 'آسور کہانی'	صدیق مجیبی	جنوری، فروری ۱۹۹۹ء	۲۵	۱
منظر شہاب: روایتوں سے جڑا جدید ترقی پسند شاعر	منصور عمر	جولائی، اگست ۱۹۹۰ء	۱۶	۴
موازنہ شبلی و براؤن	ابو سعادت جلیلی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۴
موج نسیم (نسیم ہلسوی)	محمد عبدالقادر احقر	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
موزوں عظیم آبادی: نغز گو فارسی شاعر	احتشام عباس زیدی	اپریل تا جون ۱۹۸۲ء	۸	۲
مولانا ابوالکلام آزاد اور اخبار 'دارالسلطنت'	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
مولانا آزاد کے ثقافتی اور تعلیمی نظریات	محمد حامد علی خاں	جولائی، اگست ۱۹۹۱ء	۱۷	۴
مولانا ابوالکلام آزاد پر چند بے بنیاد اعتراضات	عبداللطیف اعظمی	اپریل تا جون ۱۹۸۶ء	۱۲	۲
مولانا ابوالکلام آزاد: قومی ایکتا کے علمبردار	فخرالدین عارفی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۷ء	۱۳	۱
مولانا ابوالکلام آزاد کے دینی افکار	ڈاکٹر احتشام بن حسن	جنوری، فروری ۱۹۹۰ء	۱۶	۱
مولانا جلال الدین رومی کی شاعری	نور مکتوبی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء	۱۵	۴
مولانا حسرت موہانی کی افسانوی شخصیت	نامی انصاری	مارچ، اپریل ۱۹۹۷ء	۲۳	۲
مولانا سعید حسرت عظیم آبادی: شخصیت اور کارنامے	حقانی القاسمی	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
مولانا سید ابوظفر ندوی: ایک عالم جو بہار میں کم معروف رہا	شہاب الدین دسنوی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۳
مولانا شاہ مجیب الحق کمالی فردوسی: ایک باکمال مرد درویش، صوفی شاعر	شاہ رشاد عثمانی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
مولانا عبیدی اور ان کی اردو شاعری کا تعارف	محمد شمیم خاں	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۴

مولانا محمد ابو مصلح سہرامی مرحوم	حاذق ضیائی سہرامی	اپریل تا جون ۱۹۸۶ء	۱۲	۲
مولانا محمد علی جوہر: ایک عہد ساز شخصیت	تاج پیامی	جنوری ۱۹۷۹ء	۵	۱
مولانا محمد علی جوہر اور ان کے نامور ہم عصر مولانا ابوالکلام آزاد	عبدالقوی دسنوی	جولائی، اگست ۱۹۹۴ء	۲۰	۴
مولانا محمد علی جوہر: سیاست اور صحافت کے آئینے میں	پروفیسر غنی حیدر	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
مولانا محمد علی جوہر کی صحافت	عتیق احمد صدیقی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
مومن اور شاد: ایک تقابلی مطالعہ	اسمٰعیل حسنین نقوی	فروری، مارچ ۱۹۷۹ء	۵	۳/۲
مومن کی بت پرستی	پرویز شاہدی (مرحوم)	فروری، مارچ ۱۹۸۰ء	۶	۳/۲
'مہابھارت' میں یقین کامل برذات مطلق کا تصور	قیوم خضر	مئی ۱۹۸۰ء	۶	۵
مہجور شمسی: شخصیت اور فن	اوج اکبرپوری	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
مہجور شمسی کی شاعری	جمیل ظہیر	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	۶/۵
میتھلی کے لوک گیت	منظر شہاب	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
میر انیس کی اردو رباعیاں	اختر قادری	جنوری ۱۹۷۶ء	۲	۱
میر اور اس کی قنوطیت	قمر شاداں	ستمبر ۱۹۷۹ء	۵	۹
میر اور خان آرزو	نیر مسعود	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۳ء	۹	۴
میر تقی میر: آیات حق کی شاعری	عنوان چشتی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
میر تقی میر: حیات اور شاعری	صبا عظیم آبادی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء	۱۴	۱
میر کا تصور انسان	عبدالمغنی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳
میر کا شعری عرصہ حیات	ابن فرید	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء	۹	۳
میر و نظیر: ایک جائزہ	طلعت حسین نقوی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
میرے بھی صنم خانے: ایک تنقیدی مطالعہ	ارتضیٰ کریم	جنوری تا مارچ ۱۹۸۶ء	۱۲	۱

(ن)

نادم بلخی: میرا ساتھی، میرا دوست	انیس امام	جنوری تا اپریل ۱۹۹۴ء	۲۰	۲/۱

ناوک حمزہ پوری کی فارسی شاعری	سید غلام الحسنین	نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۶
ناول کا فن	کلیم الدین احمد	جون ۱۹۸۰ء	۶	۶
ناول میں کردار نگاری کی اہمیت	سرفراز اختر	جنوری ۱۹۸۰ء	۶	۱
نثار احمد فاروقی اور میر کی تلاش	مظہر امام	جنوری، فروری ۱۹۹۷ء	۲۳	۱
نثری نظم	وہاب اشرفی	جنوری ۱۹۷۶ء	۲	۱
نجیب اشرف ندوی	شہاب الدین دسنوی	جولائی ۱۹۷۶ء	۲	۴
نذیر احمد کا عہد اور ان کے نظریات	ڈاکٹر بدر النسا	نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۶
نذیر احمد کا نظریہ ناول	اشفاق احمد اعظمی	اگست ۱۹۸۱ء	۷	۸
نریندر لوتھر کی مزاح نگاری	گوپی چند نارنگ	جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء	۱۱	۱
نشور واحدی: 'فکر حسین' سے 'آہ رسا' تک	ایس ایم عباس	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
نصف ملاقات: چند وضاحتیں بھی	سید احمد شمیم	نومبر، دسمبر ۱۹۹۵ء	۲۱	۶
نصیر حسین خیال کی ایک نادر تحریر	کلیم سہسرامی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء	۸	۴
نظام رامپوری پر شاد عارفی کی تحقیقات کی حقیقت	شکیب رام پوری	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
نظامی 'دیا سلائی': ایک مطالعہ	محمد مظاہر الحق	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
نظم 'ساقی نامہ' اور فلسفہ خودی	منیر فاروقی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
نظم کا ترجمہ مشکل ہے	کلیم الدین احمد	جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء	۱۰	۱
نظم کی تنقید اور اس کے مسائل	محمد توقیر عالم	ستمبر ۱۹۷۹ء	۵	۹
نظم 'ہمالہ' کا تنقیدی جائزہ	راشدہ خانم	جولائی ۱۹۸۰ء	۶	۷
نظیر اکبر آبادی	طلعت حسین نقوی	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵
نظیر اکبر آبادی: حیات و شاعری	تاج پیامی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۵ء	۱۱	۴
نظیر اکبر آبادی: وطن کا نغمہ گر	صغریٰ مہدی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۳ء	۹	۱
نظیر: ہندوستانی کلچر کا محافظ	ایم اے مشتاق	جولائی، اگست ۱۹۹۱ء	۱۷	۴
نعت گوئی کا فن	ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۸ء	۱۴	۳
نفسیاتی اسکول کے افسانے	ڈاکٹر محمد محسن	مئی، جون ۱۹۸۱ء	۷	۶/۵

نقشِ جمیل: تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر منصور عمر	مارچ، اپریل ۱۹۹۱ء	۱۷	۲
نل دمن فیضی اور مہابھارت	ڈاکٹر محمد طیب صدیقی	اکتوبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۰
نمائندہ اردو شاعرات کے کلام پر ایک نظر	محمود عالم	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء	۱۳	۴
نواب یار محمد خاں شوکت شاگرد غالب	کالی داس گپتا رضا	جنوری تا مارچ ۱۹۸۲ء	۸	۱
نوبل پرائز برائے ادب	پروفیسر خورشید سمیع	ستمبر ۱۹۷۹ء	۵	۹
نہال عظیم آبادی	بہزاد فاطمی	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء	۲۵	۴ تا ۶
نیاز کا اسلوب	ممتاز احمد خاں	جنوری تا مارچ ۱۹۸۲ء	۸	۱
نیا عہد نامہ	راشد شاذ	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
نیپال میں اردو کے اثرات	ڈاکٹر نسیم اختر	جنوری تا اپریل ۱۹۹۲ء	۱۸	۱/۲
نیپالی اور اردو: اشتراک کے چند نمونے	ڈاکٹر نسیم اختر	مارچ، اپریل ۱۹۹۰ء	۱۶	۲
نیپالی لوک گیت میں اردو عناصر	ڈاکٹر نسیم اختر	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
نئی تنقید: منظر و پس منظر	ڈاکٹر ناز قادری	جنوری ۱۹۸۰ء	۶	۱
نئی غزل کا مزاج	اسعد بدایونی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
نئی غزل میں الفاظ و زبان کا تخلیقی استعمال	ظہیر غازی پوری	نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۶
نئی نسل کا تعلیمی منظر نامہ	ڈاکٹر ممتاز احمد	مئی، جون ۱۹۹۵ء	۲۱	۳
نئی نسل کی تربیت	اشرف صدیقی	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۱/۱۲
نئے افسانے کی کروٹیں	پروفیسر مظفر حنفی	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۰ء	۱۶	۵
نئے اوزان رباعی کی افادیت؟	ناوک حمزہ پوری	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء	۲۵	۴ تا ۶

(و)

واقف آروی (علامہ): ایک پراسرار شخصیت	رضوان اللہ آروی	جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء	۲۲	۱/۲
واقف آروی (علامہ) بحیثیت ناقد	عبدالوحید	جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء	۲۲	۱/۲
واقف آروی (علامہ): حیات و شاعری	شگفتہ عارف	جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء	۲۲	۱/۲
واقف آروی: کیا وہ گدا بھی صاحب طبع غیور تھا	احمد یوسف	مئی، جون ۱۹۹۶ء	۲۲	۳
واقف بہاری (سید ابوظفر محمد یحییٰ)	شاہ مقبول احمد	ستمبر ۱۹۷۹ء	۵	۹

وجدان اور تخلیقی عمل	م ق خان	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
وجودیت کیا ہے؟	تاج پیامی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۳
وحشت: انفرادیت کے قتیل	اشفاق احمد	مئی، جون ۱۹۹۱ء	۱۷	۳
وحشت کلکتوی کا ایک سہسرامی شاگرد	ڈاکٹر شعیب راہی	ستمبر ۱۹۸۱ء	۷	۹
وحیدالدین احمد وحید	ساحل احمد	جنوری تا مارچ ۱۹۸۵ء	۱۱	۱
ودیاپتی کی دس نظمیں	شمیم احمد صدیقی	اپریل ۱۹۷۶ء	۲	۲
ودیاپتی: میتھلی زبان کا عظیم شاعر	شمیم احمد صدیقی	اپریل ۱۹۷۶ء	۲	۲
وزیر آغا کی غزل کا ایک زاویہ	ڈاکٹر شہپر رسول	جنوری تا اپریل ۱۹۹۴ء	۲۰	۲/۱
وطنی شاعری کے دو عظیم شاہکار ('مشعل آزادی' اور 'نہرو نامہ')	تاراچرن رستوگی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
ولایت علی 'بمبوق' (حاجی)	بیگم انیس قدوائی	جولائی ۱۹۷۶ء	۲	۴
ولی کاکوی کی ادبی شخصیت: ایک جائزہ	منظور الرحمن اختر کاکوی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
وہ (شین مظفر پوری) کون تو نہیں تھا لیکن	رضوان اللہ آروی	نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء	۲۲	۶

(ہ)

ہاشم عظیم آبادی کی مزاح نگاری	ڈاکٹر رضوان اللہ آروی	جنوری، فروری ۱۹۹۱ء	۱۷	۱
ہائیکو کے عروضی وصوتی نظام کی تخلیقیت شناسی	مناظر عاشق ہرگانوی	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء	۲۰	۶/۵
ہم اور ہمارا ادب	ڈاکٹر خورشید سمیع	مارچ، اپریل ۱۹۹۵ء	۲۱	۲
ہم اور ہمارے بچے	قمر النسا بیگم	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۲/۱۱
ہمایوں اور مشترکہ ہندوستانی تمدن کی ابتدائی تشکیل	شکیل الرحمن	ستمبر تا دسمبر ۱۹۹۲ء	۱۸	۶/۵
ہمزہ اور املا کی غلطیاں	ممتاز احمد خاں	جولائی ۱۹۸۰ء	۶	۷
ہمزہ کی ماہیئت	ایم عزیز الحسن پھنہروی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۱ء	۷	۱۰ تا ۱۲
'ہم نفسان رفتہ': ایک مطالعہ	تاج پیامی	مارچ، اپریل ۱۹۹۱ء	۱۷	۲

ہندو دیو مالا اور رباعیات فراق	شہناز رعنا	اپریل ۱۹۷۹ء	۵	۴
ہندوستان میں فارسی شاعری کا ارتقا اور عروج	صبا عظیم آبادی	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
ہندوستانی رقص: ایک جائزہ	ثانی صادق	جنوری ۱۹۸۰ء	۶	۱
ہندی ادب کی دو نامور شخصیتیں	سید رضی الدین احمد	اکتوبر ۱۹۷۸ء	۴	۱۲
ہندی بنام اردو: ایک نظر ثانی	ڈاکٹر نریش	جولائی ۱۹۷۷ء	۴	۷
ہندی داں اردو خوانوں کا مسئلہ	ایس جمال محمد	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۲ء	۸	۳
ہندی زبان کا سب سے پہلا شاعر: کبیر داس	فضل الرحمن ہاشمی	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۳
ہندی کا علمبردار شاعر: رس خان	فضل الرحمن ہاشمی	اپریل تا جون ۱۹۸۵ء	۱۱	۲
ہندی کلاسیکی شاعری	شفیق عارفی	جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء	۱۰	۱
ہندی گیتوں پر اردو کا اثر	نریش	اگست ۱۹۷۵ء	۱	۱
ہنری ڈگلس اور ولیم لیلی	کاظم حسین	جولائی تا ستمبر ۱۹۸۶ء	۱۲	۳
	(ی)			
یاد ایام	ل احمد اکبرآبادی	جنوری ۱۹۷۶ء	۲	۱
یادیں: سہیل عظیم آبادی کی	عظیم اقبال	جنوری تا اپریل ۱۹۸۱ء	۷	۱ تا ۴
یائے معدولہ	ایم عزیز الحسن پھنہروی	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء	۱۰	۴
یقین دہلوی: شاعر یا متشاعر (ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)	انعام فاطمی	مارچ، اپریل ۱۹۹۱ء	۱۷	۲
یکرو کے نوحے: ایک تعارف	ڈاکٹر شمیم احمد	مئی، جون ۱۹۷۹ء	۵	٦/۵
یکے از شارحین غالب: مولٰینا سہا	مظہر امام	جولائی تا اکتوبر ۱۹۹۵ء	۲۱	۵/۴
یوسف حسین خاں کی اقبال شناسی	حامدی کاشمیری	جولائی تا دسمبر ۱۹۹۹ء	۲۵	۴ تا ٦
یہ سال ہمارا ہے	کاظمہ حیدر	نومبر، دسمبر ۱۹۷۹ء	۵	۱۲/۱۱

☆☆☆

ساجد جلال پوری
جلال پور، امبیڈکر نگر، رابطہ نمبر:7571867185

حمدیں

(۱) حمد درصنعت تابع مہمل

(اس حمد کے سارے اشعار میں مہمل الفاظ کا اتباع کیا گیا ہے۔)

رب ہی کا کلمہ پڑھتے ہیں زندہ، مردہ سب
سورج وورج، چندا وندا، تارہ وارہ سب

قول نہیں یہ میرا ہے، قرآن میں خود دیکھو
ساگر واگر، مچھلی وچھلی، دریا وریا سب

اس کی عبادت کرتے جاؤ، خود مل جائیں گی
جنت ونت، حوریںووریں، طوبیٰ ووبیٰ سب

اس کی دھرتی میں دیکھو تو سب کچھ ملتے ہیں
پتھر وتھر، چاندی واندی، سونا وونا سب

قیمت والی چیزیں بھی ہیں اس کے سمندر میں
موتی ووتی، گوہر ووہر، ہیرا ویرا سب

اس کی قدرت، اس کے کرشمے سے بن جاتے ہیں
انساں ونساں، حیواں ویواں، دنیا ونیا سب

وہ جب چاہے، جہاں بھی چاہے، آبادی ہو جائے
بنجر ونجر، جنگل ونگل، صحرا وحرا سب

اس کو جلال آجائے تو پل میں خاک میں مل جائے
بستی وستی، پربت وربت، جھرنا ورنا سب

ساری مخلوقات کو بس اللہ ہی دیتا ہے
پانی وانی، دانہ وانہ، کھانا وانا سب

ایک نظر وہ جس پر ڈالے فوراً ہی پا جائے
نعمت وعمت، ڈالر والر، پیسہ ویسہ سب

اس کی عطا سے ساجدؔ واجد لکھتے جاتے ہیں
مطلع وطلع، مقطع وقطع، املا وملا سب

(۲) حمد ومناجات درصنعت تنسیق الصفات

(اس حمد ومناجات میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کے مختلف کمالات، ذات وصفات اور خوبیوں کا ذکر اس کے اسمائے حسنیٰ کے ساتھ کیا گیا ہے......اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مکمل مناجات صنعت بغیر الف میں تخلیق کی گئی ہے۔)

تو رحیم ہے تو کریم ہے، تو قدیر ہے تو شدید ہے
تو رووف ہے تو عطوف ہے، تو شدید مثل حدید ہے

تو جلیل بھی تو جمیل بھی، تو علیم بھی تو حکیم بھی
تو متین بھی تو یقین بھی، تو رفیق بھی تو سعید ہے

تو ظہیر بھی تو نصیر بھی، تو عظیم بھی تو کبیر بھی
تو قدیم سے بھی قدیم ہے، تو جدید سے بھی جدید ہے

تو سمیع بھی تو بصیر بھی، تو بشیر بھی تو نذیر بھی
تو قریب سے بھی قریب ہے، تو بعید سے بھی بعید ہے

تو خلیق بھی تو شفیق بھی،تو حفیظ بھی تو علیم بھی
تو غفور ہے تو شکور ہے، تو صبور ہے تو رشید ہے

تو عظیم بھی تو نعیم بھی، تو مقیم قلب سلیم بھی
تو ذکی بھی ہے تو قوی بھی ہے، تو حمید ہے تو مجید ہے

تو طبیب بھی تو مجیب بھی، تو مہیب بھی تو مثیب بھی
تو ودود ہے تو صعود ہے، تو مغیث ہے تو مفید ہے

تو ممیت بھی تو مقیت بھی، تو محیط بھی، تو بسیط بھی
تو منیب ہے تو حسیب ہے، تو وحید ہے تو حمید ہے

تو رفیع بھی تو منیع بھی، تو سمیع بھی تو سریع بھی
تو علی بھی ہے تو ولی بھی ہے، تو صمد بھی ہے تو شہید ہے

تو وکیل بھی تو کفیل بھی، تو دلیل بھی تو قبیل بھی
تو مدیل ہے تو منیل ہے، تو مقیل ہے تو معید ہے

تو وفی بھی ہے، تو غنی بھی ہے، تو ملی بھی ہے تو رضی بھی ہے
تو زکی بھی ہے، تو نقی بھی ہے تو معین ہے تو عتید ہے

میں ذلیل ہوں، میں فقیر ہوں، مجھے بخش دے میں حقیر ہوں
مرے عیب کی تجھے ہے خبر تو قریب حبل ورید ہے

(۳) حمد باری تعالیٰ
(تجنیس تام مماثل)

(جب تجنیس کے دونوں لفظ ایک دوسرے کے مشابہ ہوں یعنی انواع، اعداد، ترتیب اور حرکات و سکنات میں ایک جیسے ہوں مگر ان کے معنی الگ ہوں......ساتھ ہی اگر ایک لفظ اسم تو دوسرا بھی اسم......اگر ایک فعل تو دوسرا بھی فعل......جیسے پہلے شعر میں پہلا 'مطلع' معنی آسمان، اور دوسرا 'مطلع' معنی کلام کا پہلا شعر......اسی طرح مکمل حمد اسی صنعت میں لکھی گئی ہے۔)

حمد لکھنے کا نہ گر ہم کو سلیقہ ہوتا
مطلعِ فکر پہ مطلع کا نہ جلوہ ہوتا

شہرِ رمضان میں ہر شہر جو با رونق ہے
ایسا موسم اے خدا کاش ہمیشہ ہوتا

اپنی صورت پہ یہ انسان کہاں اتراتا
رحمِ مادر میں اگر رحم نہ تیرا ہوتا

تُو جو قطرے کو خد و خال نہ قامت دیتا
امّ و اب، اخت نہ یہ خال کا رشتہ ہوتا

کارِ دنیا میں خدا نے ہمیں برکت دی ہے
ورنہ اولاد، نہ یہ کار نہ بنگلہ ہوتا

اپنے اعضا کی کرو قدر یہ کل پرزے ہیں
کل کہاں ملتا اگر کل کوئی ڈھیلا ہوتا

آب کی چاہ ہمیں لے کے گئی چاہ کے پاس
پانی ہوتا نہ تو انسان یہ پیاسا ہوتا

ہم اٹھا پاتے کہاں کام و دہن کی لذت
رزق دیتا نہ خدا کام نہ دھندہ ہوتا

کان یہ شور مشینوں کا کہاں سن پاتے
رب کی قدرت سے نہ گر کان میں لوہا ہوتا

دم لگایا تھا ترے نام پہ آخر دم تک
ہم موحّد سے، کہاں غیر کا سجدہ ہوتا

تختۂ دار سے جاتے نہ اگر دارِ بقا
پھر مقام اپنا کہاں خلد میں اونچا ہوتا

حق جو آئین کی دھارا سے نہ ملتا ساجدؔ پھر خلاف اپنے زمانے کا بھی دھارا ہوتا

(۴) حمد باری در صنعت تجنیس تام مستوفی

(اگر تجنیس کے الفاظ مختلف نوع کے ہوں یعنی ایک اسم دوسرا فعل یا ایک اسم دوسرا حرف وغیرہ تو اسے تجنیس تام مستوفی کہیں گے جیسے اس حمد کے پہلے شعر میں کالی بمعنی کالا رنگ اور دوسرے مصرع میں کالی بمعنی کالی دیوی......اسی انداز سے پورا کلام ہے۔)

گھٹا سی کالی ہو یا آسماں کی لالی ہو وہ لکشمی سی کوئی دیوی ہو کہ کالی ہو
جہاں میں کوئی نہیں ہے جہاں تلک دیکھو جو تیری ذات سے بڑھ کر جناب عالی ہو
تری ہی پالی ہوئی ہر زبان دنیا کی پراکرت، عربی، فارسی کہ پالی ہو
حرم کی پاؤں زیارت تو ننگے پاؤں چلوں کہ جس طرح کوئی کاسہ لیے سوالی ہو
تو مار دیتا ہے گر ابرہہ سا مار آئے حرم نہ ڈھائے گا غنڈہ ہو یا موالی ہو
نسیم صبح نے ڈالی جو اک نگاہ کرم شباب آ گیا، غنچہ ہو، گل کہ ڈالی ہو
گھٹا کا زور گھٹا دے تو گرم ہو جائے وہ سرد شہر ہو، شملہ ہو یا منالی ہو
مراد مانگ لے تجھ سے تو مانگ بھر جائے وہ ماں کہ بیٹے سے آغوش جس کی خالی ہو
تری جلالی صفت ہر جگہ نظر آئی جلال پور مرا شہر یا جلالی ہو
دیا جلا دیا الفت کا روشنی کے لیے وہ رات عید کی ساجدؔ ہو یا دوالی ہو

☆☆☆

مختصر تعارف: شاعر، ادیب و انشائیہ نگار ساجد جلال پوری ۱۴؍جون ۱۹۷۹ء کو جعفر آباد، جلال پور، امبیڈکر نگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام تنویر حسن ہے۔ ۱۹۹۷ء سے شاعری کی ابتدا کی۔ محکمۂ تعلیم حکومت اتر پردیش میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں خصوصی دلچسپی ہے۔ ان کے انشائیوں کا مجموعہ ’رنگ رنگ کے شاعر‘ ۲۰۲۰ء میں منظر عام پر آ چکا ہے، جسے اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے اعزاز سے بھی نوازا۔ دوسری کتاب علم بلاغت و بدیع کے حوالے سے ’رنگ رنگ کی صنعت‘ عنقریب منظر عام پر آ رہی ہے، جس میں ۷۰ مختلف صنعتوں میں ۷۰ حمدیں شامل ہیں۔ ان کے انشائیے، مضامین، حمدیں، غزلیں بھارت، پاکستان، نیپال، خلیجی ممالک اور امریکا وغیرہ کے پچاس سے زائد اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی

قندمکرر

ولادت:۷۲۶ ہجری[شیراز]۔وفات:۷۹۲ ہجری[شیراز]

غزلیں

۱

عیب رندان مکن ای زاہد پاکیزہ سرشت	کہ گناہ دگران بر تو نخواہند نوشت
من اگر نیکم و گر بد تو برو خود را باش	ہر کسی آن دِرَوَد عاقبت کار کہ کشت
ہمہ کس طالب یارند چہ ہشیار و چہ مست	ہمہ جا خانہ عشق است چہ مسجد چہ کنشت
سر تسلیم من و خشت در میکدہ ہا	مدعی گر نکند فہم سخن گو سر و خشت
ناامیدم مکن از سابقہ لطف ازل	تو پس پردہ چہ دانی کہ کہ خوب است و کہ زشت
نہ من از پردہ تقوا بہ درافتادم و بس	پدرم نیز بہشت ابد از دست بہشت
حافظا روز اجل گر بہ کف آری جامی	یک سر از کوی خرابات برندت بہ بہشت

۲

پیرانہ سرم عشق جوانی بہ سر افتاد	وان راز کہ در دل بنہفتم بہ درافتاد
از راہ نظر مرغ دلم گشت ہواگیر	ای دیدہ نگہ کن کہ بہ دام کہ درافتاد
دردا کہ از آن آہوی مشکین سیہ چشم	چون نافہ بسی خون دلم در جگر افتاد
از رہگذر خاک سر کوی شما بود	ہر نافہ کہ در دست نسیم سحر افتاد
مژگان تو تا تیغ جہانگیر برآورد	بس کشتہ دل زندہ کہ بر یک دگر افتاد
بس تجربہ کردیم در این دیر مکافات	با دردکشان ہر کہ درافتاد برافتاد
گر جان بدہد سنگ سیہ لعل نگردد	با طینت اصلی چہ کند بدگہر افتاد
حافظ کہ سر زلف بتان دست کشش بود	بس طرفہ حریفیست کش اکنون بہ سر افتاد

☆☆☆

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ
ولادت: ۲۷؍دسمبر ۱۷۹۷ء [اکبرآباد]۔ وفات: ۱۵؍فروری ۱۸۶۹ء [دہلی]

غزلیں

(۱)

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں

جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرت قتل گہہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

عشرت پارۂ دل زخم تمنا کھانا
لذت ریش جگر غرق نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۲)

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

تا قیامت شب فرقت میں گزر جائے گی عمر
سات دن ہم پہ بھی بھاری ہیں سحر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(۳)

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہرچند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۴)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

☆☆☆

ڈاکٹر انصاری عبدالرحمن
بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، رابطہ نمبر: 9910673095

'فسادنامہ': ۱۸۵۷ء کی ایک تاریخی مثنوی

دہلی میں ہوئی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے متعلق فارسی زبان میں لکھے گئے تاریخی رسالوں کا ذکر کم ملتا ہے۔ جن انگشت شمار رسالوں کا سراغ ملتا بھی ہے، وہ قلمی نسخوں کی شکل میں کتب خانوں کی زینت ہیں۔ اس سلسلے کے دو اہم رسالے؛ 'دستنبو' از مرزا غالبؔ (۱۷۹۷ء-۱۸۶۹ء) اور 'نبرد نامہ' از منشی گھنشیام لال عاصیؔ (۱۷۹۸ء-۱۸۵۷ء) قابل ذکر ہیں۔[۱] غالب کے دستنبو کی طرح نبرد نامہ بھی تاریخی و ادبی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس کے مولف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے عینی شاہد تھے اور انھوں نے اسے مسجع فارسی نثر میں تحریر کیا ہے جو ان کے ادبی ذوق اور لسانی دسترس پر دلالت کرتا ہے۔ راقم سطور نے گزشتہ سال 'نبرد نامہ' کا فارسی متن مع مقدمہ و تصحیح شائع کیا ہے۔ اس کے آخر میں نبرد نامہ کا منظوم اردو ترجمہ بھی شامل ہے جسے مرزا غالبؔ کے شاگرد اور عاصیؔ کے نواسے منشی بہاری لال مشتاقؔ (۱۸۳۶ء-۱۹۰۸ء) نے اردو میں کیا تھا۔

بہاری لال مشتاقؔ کا شمار مرزا غالبؔ کے شاگردوں اور انیسویں صدی کے دوئم درجے کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ مشتاقؔ کے والد کا نام رائے من بھاول تھا اور وہ قوم کے کائستھ ماتھر تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۳۶ء میں شاہجہان آباد (دہلی) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولوی امین الدین امینؔ (مولف قاطع القاطع) کے مکتب سے حاصل کی۔ عنفوان شباب میں جب شاعری کا شوق ہوا تو حکیم محمود خان اور حکیم غلام رضا خان کی وساطت سے مرزا غالب کی شاگردی اختیار کی۔ مشتاقؔ کو خطاطی میں بھی مہارت حاصل تھی اور اس فن میں مرزا عبیداللہ بیگ کے شاگرد تھے۔ اسی فن کی بدولت ہفتہ واری 'اکمل الاخبار' کی کتابت اور بعد میں ادارت نصیب ہوئی۔ خوش نویسی کی ہی وجہ سے مرزا غالبؔ اپنے آخری ایام میں ان سے اپنے خطوط لکھوایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مشتاقؔ نے اردوئے معلیٰ کی ترتیب و تحریر میں نمایاں کوشش بھی کی تھی جس کا ذکر 'اردوئے معلیٰ' کی تقریظ میں ملتا ہے۔[۲]

۱۸۸۷ء میں بہاری لال نے لالہ سری کرشن داس گڑ والہ کی منشی گری اختیار کی اور ۱۹۰۸ء میں بہتر

سال کی عمر میں دہلی میں انتقال ہوا۔ ڈاکٹر بھگوت سروپ نے ۱۹۳۸ء میں بہاری لال کے منتخب کلام کو بعنوان ' کلام مشتاقؔ ' کائستھ اردو سبھا دہلی سے شائع کیا ہے جس میں ۷ ر پہیلیاں، مثنوی فتوح امید، مسدس قرارداد، سہرا، ۳ر فارسی غزلیں اور ایک رباعی شامل ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کسی دوسری کتاب یا شعری مجموعہ کا پتہ نہیں چلتا۔[۳] فساد نامہ بہاری لال مشتاقؔ کی ایک اہم تاریخی مثنوی ہے جو گوشۂ گمنامی میں تھی۔ اس کا ذکر کسی تذکرہ یا تاریخ میں نہیں ملتا۔ چوں کہ یہ مثنوی نبرد نامہ کا ترجمہ ہے اس لیے یہ نبرد نامہ کے دو قلمی نسخوں میں شامل ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ نسخۂ مولانا ابوالکلام آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک، شمارہ: ۳۷۷۳، سائز ۱۶X۲۹، ۱۷، ۱۷ اسطر، خط نستعلیق، تاریخ کتابت: مارچ ۱۸۶۱ء، صفحہ ۵۰ تا ۸۴۔

۲۔ نسخۂ مرکزی لائبریری بنارس ہندو یونیورسٹی، شمارہ ۹۱۲، سائز ۱۶، ۶ ½، ۱۰ ¾، ۱۷ سطر، خط نستعلیق، تاریخ کتابت: ۱۸ر مئی ۱۸۶۱، صفحہ ۵۹ تا ۶۷۔[۴]

تاریخی اعتبار سے ٹونک کا نسخہ قدیم ترین ہے اور قدامت کو مدّنظر رکھتے ہوئے راقم سطور نے اسی نسخے کے متن کو اساس قرار دیا ہے۔ اس نسخے میں مثنوی کا کوئی نام نہیں درج ہے۔ ترقیمہ میں مثنوی کے بارے میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے:

"تمت بالخیر وقائع فساد نامہ مفسدان باغی صاحبان والاشان انگریز بہادر مالک چہار دانگ بحری وراعی جہان، مارچ ۱۸۶۱ء۔"[۵]

(ترجمہ: دنیا کے بحر و برّ کے مالک صاحبان والا شان انگریز بہادر کے مفسد باغیوں کا یہ فساد نامہ مکمل ہوا، مارچ ۱۸۶۱ء۔)

اسی عبارت کی بنا پر راقم سطور نے اس مثنوی کو' فساد نامہ' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس مثنوی کے ترقیمے میں مترجم کا نام نہیں آیا ہے۔ بنارس کے نسخے کے پہلے صفحے پر اس کا عنوان 'مثنوی پنڈت بہاری لال' درج ہے۔ اس کے علاوہ متن کے ایک شعر میں مترجم کا نام 'بہاری' آیا ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مثنوی کا ترجمہ بہاری لال مشتاقؔ نے کیا ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

بہاری، تو کر قصّہ اب مختصر نہ رکھ طول پر زیادہ اب تو نظر

مثنوی کا آغاز حمد باری تعالی کے ان اشعار سے ہوتا ہے۔

خدا کی خدائی نہ ہوری بیاں نہ طاقت قلم اور نہ عقل و زباں
جسے چاہے دم میں کرے وہ نہال جسے چاہے پل میں کرے پایمال

کسی کو وہ دے ملک (و) حشمت کا راج کسی کے رکھے سر پہ ذلّت کا تاج

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کے وقائع سے اس مثنوی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے جب ہندوستانی سپاہیوں کا ایک دستہ میرٹھ سے دہلی پہنچا اور لوٹ مار، قتل و غارت کا ماحول گرم ہوگیا۔ مشتاقؔ نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے ۔

تھی تاریخ گیارویں، مہینہ مئی اٹھارہ سو پچاس، سات عیسوی
یکا یک پڑی کھلبلی شہر میں کہ فوجِ تلنگاں آئی قہر میں
ہزاروں پیادہ، ہزاروں سوار بہ خشم و غضب لیے تیغ آبدار
یہ میرٹھ سے جو اٹھا ہے ولولہ خدا جانے کیا بات ہے برملا
نہ حاکم کا ڈر ہے، نہ کچھ ہے خطر بڑا اک فساد ہورہا سر بسر

سپاہیوں کی دہلی میں آمد سے ہر جگہ خیمے نصب ہونے لگے اور پورا شہر چھاؤنی میں تبدیل ہوگیا۔ قرب و جوار کے سپاہی جو فرنگیوں کے استبداد سے تنگ آ گئے تھے، انھوں نے بھی دہلی کا رخ کیا اور دیکھتے دیکھتے دہلی دروازہ سے لال قلعہ تک کا علاقہ ایک عظیم خیمہ گاہ میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ شہر میں سپاہیوں کے آتے ہی لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ اس کے علاوہ شہرارم دہلی کو بھی کئی آسیب کا سامنا کرنا پڑا۔ لال قلعہ کے دیوان عام و خاص اور مہتاب باغ کی عمارتیں برباد ہونے لگیں اور گل و گلزار نذر آتش ہونے لگے۔ مشتاقؔ اس بارے میں لکھتے ہیں ۔

دیوان عام اور خاص مہتاب باغ لیا گھیر، منڈلائیں چوں چیل و زاغ
جہاں تھے چمن، موتیاں اور سمن وہاں لوٹے لے لے کے بیٹھے مگن
جامن، آنبہ، نارنج کی ٹہنی کانٹ لگے پھونکنے چولہوں میں پات پات

انگریزی افسران دوسرے فوجی دستوں کی آمد کے منتظر تھے۔ اسی درمیان پنجاب سے فوجیوں کا ایک دستہ ان کی مدد کو پہنچا اور انگریز، سپاہیوں کی بغاوت کو کچلتے ہوئے علی پور میں گھس گئے اور گولی باری سے ان کے چھکے چھڑا دیئے ۔

یکا یک خبر یہ ہوئی مشتہر کہ فوج فرنگ آگئی پھر اِدھر
سونی پت سے یہی فوج آگے بڑھی مارا سرکشوں کو اور توڑی کڑی
وہاں سے چلے علی پور کو آئے ہر اک جا دیے مورچہ بھی لگائے
یہ سن کر خبر، سرکشان بے عقل ہوئے بے حواس اور گیا دل نکل

بالآخر پانی پت کے میدان میں فرنگی اور ہندوستانی سپاہیوں کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل

صف آرا ہوئیں اور جنگ شروع ہوئی۔ ہندوستانی سپاہی انگریزوں کے حملہ کی تاب نہ لا سکے اور الٹے پاؤں شہر کی طرف بھاگے اور شہر کی فصیلوں کو بند کرلیا۔ شاعر نے اس جنگ کو یوں بیان کیا ہے۔

چلے آئے جرّار آگے بڑھے		نہ دیکھی زمین اونچی نیچے گڑھے
پہلے حملہ میں ایک عالم مرا		بہت زخمی ہو کر زمیں پر گرا
اِدھر سے بھی دس بیس گولی چلی		مگر فضل رب سے نہ بچھی ہلی
آخر یہ بھاگے اور پیچھے ہٹے		وہ آگے بڑھے اور قدم سے ڈٹے
باڑے مار کے جب ہوئے یہ جو پست		رہی تاب و طاقت، نہ دم خیز و جست
یکا یک بھاگے شہر میں لے کے جان		چھوڑا توپ و اسباب، سارا سامان

جنگ میں سپاہیوں کو پسپا کرنے کے بعد انگریزوں نے دہلی کا محاصرہ کرلیا۔ ہر طرف توپیں نصب کی گئیں اور اطراف میں خندق بھی کھودی گئی۔ اس کے بعد انگریزوں اور ہندوستانی سپاہیوں میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ انگریزوں نے اس بغاوت کو کچلنے کی مکمل تیاری کر لی تھی اور ان کے پاس جنگی آلات کی بھی فراوانی تھی۔ پوری طرح اسلحوں سے لیس انگریزوں کی فوج نے پرزور حملہ کیا اور کشمیری دروازہ اور فصیل توڑ کر شہر میں داخل ہو گئے۔ مشتاقؔ نے اس حملے کی عکاسی یوں کی ہے۔

جو افواج انگریز بحر مواج		عنایت خدا سے ہے نصرت کا تاج
یکا یک کرا حملہ بے قال و قیل		لگا مورچہ دیا زیر فصیل
دو تین گولہ اس طور مارے بہ زور		کہ توپ برج گئے ٹکڑے توڑ
اور دروازہ کشمیری پر کر گزر		لگا سیڑھیاں چڑھ گئے وہ اوپر
باغی واں سے جھٹ، آئے پیچھے کو ہٹ		گورے موری دروازہ تک گئے ڈٹ

یکا یک فوج کے شہر میں داخل ہونے سے لوگوں میں افرا تفری مچ گئی اور اپنی جان کی امان کے لیے عوام وخواص، حیران و پریشان، بھوکے پیاسے، پیادہ یا سوار جیسے بھی ممکن ہوا، شہر سے ہجرت کرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے خانقاہ چراغ دہلی اور عرب کی سرائے میں بھی پناہ لی۔ غرض یہ کہ دہلی میں ابتری پھیل گئی۔ شاعر نے اس حولناک منظر کو یوں بیان کیا ہے۔

رعیت و خلقت ساری بھاگی جائے		عجب اک مصیبت و قہر خدائے
گاڑی، چھکڑا، رتھ، کیوڑا، ٹٹو سوار		ننگے پاؤں پیادہ کریں سب فرار
چھوٹے چھوٹے بچے، لنگڑے لولے		جوان اور بڈھے، ٹوٹے کولہے

وہ شہزادیاں آلِ شاہ تیمور جسے دیکھ شرمندہ ہوں ماہ و حور
وہ تنہا پھریں کچھ نہیں بندوبست صحرا دشت میں دست و پا جائے خست
عرب کی سرائے اور دہلی چراغ قطب صاحب کو اور ناظر کی باغ
ربوپورہ، پالم، حویلی تہاڑ کوئی بیچ میداں و اندر پہاڑ
کوئی کہے رستہ ہمیں دو بتا کوئی کہے پانی مجھے دو پلا

اس کے بعد ہندوستانی سپاہیوں کی گرفتاری عمل میں آئی اور ان کے خلاف کارروائی بھی کی گئی۔ بہادر شاہ ظفر پر بھی مقدمہ چلا اور انھیں رنگون بھیج دیا گیا۔ شہر پر تسلط پانے کے بعد انگریزوں نے اپنے حامیوں کو دہلی آنے کی دعوت دی اور انھیں انعامات سے نوازا گیا۔ 'فسادنامہ' میں یہ سب واقعات اچھے اسلوب اور سادہ پیرایے میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے آخری حصہ میں ملکہ وکٹوریہ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔

فسادنامہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے متعلق ایک اہم مثنوی ہے جسے منشی بہاری لال مشتاقؔ نے فارسی نثر سے اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے مطالعہ سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ منشی گھنشیام لال عاصیؔ انگریزوں کے طرفدار تھے، اس لیے 'نبردنامہ' میں انگریزوں کی مدح اور ہندوستانی سپاہیوں کے لیے نازیبا الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ مشتاقؔ نے بھی من وعن انہی الفاظ کو اپنے ترجمہ میں شامل کیا ہے۔ ہر چند اس مثنوی کے کچھ مصرعے ناموزوں اور بحر سے خارج نظر آتے ہیں، لیکن ایک تاریخی دستاویز اور ایک کم معروف شاعر کا فراموش شدہ کلام ہونے کی حیثیت سے اس کی تاریخی اہمیت مسلّم ہے۔ ☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ انصاری، عبدالرحمن، نبردنامہ اور اس کا اصل مولف، سہ ماہی فکر و تحقیق، ج ۲۵، اپریل تا جون ۲۰۲۲ء، شمارہ ۲، ص ۱۴۰ - ۱۵۴

۲۔ غالبؔ، مرزا اسداللہ خاں، اردوئے معلّٰی، بہ اہتمام حکیم حافظ احمد، لاہور، بے تا، مقدمہ، ص ۳

۳۔ مشتاقؔ، بہاری لال، کلامِ مشتاق، مرتبہ: بھگوت سروپ، کائستھ اردو سبھا، دہلی، ۱۹۳۸ء، ص ۴-۸

۴۔ عشرت، امرت لعل، فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی دانش گاہ ہندو یی بنارس، ترجمہ: حوری سادات پروین فر، میراث مکتوب، تہران، ۲۰۲۳، ص ۱۳۷

۵۔ عاصیؔ، منشی گھنشیام لال، نبردنامہ، مقدمہ و تصحیح: انصاری عبدالرحمن، مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۲۳ء، ص ۱۶۸

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

نام کتاب	: شہاب ظفر اعظمی کا مطالعہ شعر
مرتب	: ڈاکٹر محمد منہاج الدین
صفحات	: ۲۴۸ قیمت : ۳۰۰/روپے
سال اشاعت	: ۲۰۲۲ء مطبع : مرکزی پبلی کیشنز
ناشر	: مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵
تبصرہ نگار	: فیضان حیدر (معروفی)

اردو کے شعری ونثری ادب میں تحقیق وتنقید کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ایک عمدہ تحقیقی کتاب نہ صرف ادبی شخصیات کو اجاگر کرتی ہے بلکہ قارئین کو علم وادب کے نئے زاویے سے بھی روشناس کراتی ہے۔ ڈاکٹر محمد منہاج الدین کی مرتب کردہ کتاب 'شہاب ظفر اعظمی کا مطالعہ شعر' اس لحاظ سے ایک اہم کارنامہ ہے، جو شعری تنقید کے حوالے سے نہایت قابلِ قدر مواد فراہم کرتی ہے۔

شہاب ظفر اعظمی اردو ادب کا وہ روشن ستارہ ہے جس کی تنقید وتحقیق نے اردو ادب میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ ان کی شخصیت محض ایک نقاد تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک ادیب، محقق اور مفکر کے ساتھ شاعر کے طور پر بھی اپنی شناخت قائم کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر منہاج الدین نے اس کتاب کے ذریعے نہ صرف شہاب ظفر اعظمی کی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے بلکہ ان کی شعری تنقید کے مختلف پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ کتاب میں شہاب ظفر اعظمی کے ان مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو شعرا اور ان کے فن کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔

کتاب کا نمایاں پہلو اس کا مقدمہ ہے، جو چونتیس صفحات کو محیط ہے۔ ڈاکٹر منہاج الدین نے اس مقدمے میں شہاب ظفر اعظمی کی زندگی، ان کے ادبی سفر اور ان کی علمی وتنقیدی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے نہایت عمدگی سے شہاب ظفر اعظمی کے مضامین کو جمع کیا اور انھیں منظم صورت میں پیش

کیا۔ مقدمہ خاص طور پر اس کتاب کا دل ہے، جس میں شہاب ظفر اعظمی کی زندگی کے مختلف پہلو، ان کی ادبی فتوحات اور ان کی تنقیدی بصیرت کو دل کش انداز میں سمیٹنے کی سعی کی گئی ہے۔

کتاب میں شامل تقریباً سبھی مضامین اہم اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان مضامین میں اردو شاعری کے مختلف رجحانات، اہم شخصیات کے شعری محاسن اور جدید ادب کے تنقیدی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب میں شامل پہلا مضمون 'راجا رام نرائن موزوںؔ کی اردو شاعری' ہے۔ یہ مضمون اردو کے اس اہم شاعر کے فکری و فنی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے، جنھیں اکثر ان کی ہم عصر شعری تحریکوں میں نظر انداز کیا گیا۔ شہاب ظفر اعظمی نے موزوںؔ کی شاعری کو نہ صرف ایک تاریخی پس منظر میں دیکھا بلکہ ان کے کلام کے موضوعات اور اسلوب کی انفرادیت کو بھی نمایاں کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا مضمون 'حالیؔ کی غزل' ہے۔ شہاب ظفر اعظمی نے حالی کی غزل کو کلاسیکی اور جدید تناظر میں جانچا اور پرکھا ہے۔ یہ مضمون حالی کی غزلیہ شاعری، ان کے فکری انداز، اور ان کی اصلاحی شاعری کو منفرد زاویے سے پیش کرتا ہے، جو اردو ادب کے قارئین کے لیے نئے دریچے وا کرتا ہے۔

کتاب کا تیسرا مضمون 'جمیلہ خدا بخش: شخصیت اور شاعری' ہے۔ اس مضمون میں شہاب ظفر اعظمی نے جمیلہ خدا بخش کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں موجود نسائی احساسات، سماجی شعور اور فکری آزادی کے پہلوؤں کو نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔

کتاب میں شامل ایک اہم مضمون 'جدید اردو غزل میں ہیئت کے تجربے' ہے۔ یہ مضمون اردو غزل میں جدت اور تجربے کی روایت پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے مختلف شعرا کے ہیئتی تجربات کا تجزیہ کرتے ہوئے غزل کے امکانات کو روشن کیا ہے۔ یہ مضمون اردو غزل کی ترقی اور اس کے بدلتے رجحانات کو سمجھنے میں مدد و معاون ہے۔

کتاب کا نواں مضمون 'جمیل مظہری کی نظموں میں عظمت آدم اور احترام انسانیت' ہے۔ جمیلؔ مظہری کے کلام میں انسانی عظمت اور انسانیت کے احترام کا جو پہلو ملتا ہے، اس مضمون میں اسے نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ شہاب ظفر اعظمی نے جمیلؔ مظہری کی نظموں کے فکری اور جمالیاتی پہلوؤں کو نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔

کتاب کا دسواں مضمون 'پرویز شاہدی کی نظمیں: شعری جمالیات کا آئینہ' پرویز شاہدی کی نظموں کے جمالیاتی پہلوؤں پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے ان نظموں میں موجود داخلی کیفیت، فکری گہرائی اور فنی مہارت کو نہایت دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے، جو قارئین کو پرویز شاہدی کے شعری کمالات سے

روشناس کراتا ہے۔

کتاب میں شامل ایک اور اہم اور قابل قدر مضمون 'ظفر صدیقی: غزل زمین پر ننگے پاؤں چلنے والا شاعر' ہے جس میں ظفر صدیقی کی غزلوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے ان کی شاعری کی عوامی زبان، زمینی حقیقتوں اور سادہ مگر گہرے جذبات کو اجاگر کیا ہے۔ یہ مضمون ظفر صدیقی کے شعری اسلوب کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

کتاب کے آخر میں دو اہم شخصیات کے انٹرویوز بھی شامل ہیں۔ پہلے انٹرویو کا عنوان 'مخمور سعیدی سے مصاحبہ' ہے جس میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے مخمور سعیدی کی ادبی زندگی، ان کے خیالات، اور ان کے تخلیقی عمل کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے انٹرویو کا عنوان 'کلیم عاجز کے ساتھ گفتگو' ہے جس میں کلیم عاجز کی شخصیت اور شاعری پر مبنی گفتگو نہایت دلچسپ اور ادبی بصیرت سے بھرپور ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے ان کی زندگی، شاعری اور اردو ادب میں ان کے کردار کو نہایت خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔

کتاب کی زبان سادہ اور دل نشیں ہے، جو عام قارئین اور ادبی حلقوں دونوں کے لیے یکساں طور پر قابلِ فہم ہے۔ اس میں شامل مضامین سے شہاب ظفر اعظمی کی تنقیدی بصیرت، شعر فہمی اور شعرا کے فن کے عمق کو سمجھنے کی صلاحیت نمایاں ہوتی ہے۔ ڈاکٹر منہاج الدین کی مرتب کی حیثیت سے محنت ہر صفحے پر جھلکتی ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے مفید و کارآمد ثابت ہوگی جو تنقید و تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر منہاج الدین کا یہ کارنامہ شہاب ظفر اعظمی کی شخصیت اور فن کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ یہ کتاب ادب سے وابستہ طلبہ، اساتذہ اور شائقین کے لیے نہایت مفید ہے۔



نام کتاب	: نکاتِ فن		
مصنف	: ڈاکٹر سید الفت حسین		
صفحات	: ۲۵۶	قیمت	: ۴۰۰ روپے
سال اشاعت	: ۲۰۲۲ء	مطبع	: مرکزی پبلی کیشنز
ناشر	: مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵		
تبصرہ نگار	: فیضان حیدر (معروفی)		

ادبی دنیا میں تحقیق و تنقید کو ہمیشہ اعلیٰ مقام حاصل رہا ہے۔ تحقیق کسی ادب پارے کی تہ تک پہنچنے کا

عمل ہے، جب کہ تنقید اس کے مثبت و منفی پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے۔ ڈاکٹر سید الفت حسین جنھیں ادبی دنیا میں اچھے استاد، محقق اور ناقد کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، ان خصوصیات کی عمدہ مثال ہیں۔ ان کی علمی بصیرت، تحقیقی و تنقیدی شعور نے انھیں نئی پود کے معتبر ناموں میں شامل کر دیا ہے۔

ان کی کتاب 'نکاتِ فن' اردو ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے قبل ان کی تحقیقی و تنقیدی کتاب 'اردو کی ظریفانہ شاعری کا سفر' اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے مالی تعاون سے ۲۰۱۵ء میں شائع ہو کر علمی و ادبی حلقوں میں ان کی شناخت مستحکم کر چکی ہے۔ ان کی شخصیت اور تحقیقی و تنقیدی مزاج پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محسن رضا رضوی 'معروضات' کے عنوان سے رقم طراز ہیں:

> ''الفت حسین تحقیقی و تنقیدی مزاج لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ مزاج مزید تندرست و توانا ہوتا جا رہا ہے۔ میری ملاقات ان سے گزشتہ بیس پچیس برسوں سے ہے۔ ان برسوں میں جب جب یہ میرے گھر تشریف لائے، ان کے ہاتھ، جیب یا بیگ سے کوئی نہ کوئی نیا مضمون ضرور برآمد ہوا۔ ہر ملاقات میں یہ اپنا مضمون سناتے بھی رہے اور بلا تکلف سخت سے سخت تبصرہ اور تنقید بھی ہنس کر قبول کرتے رہے۔'' (ص۱۱)

زیرِ نظر کتاب 'پیش تحریر' اور 'معروضات' کے علاوہ مختلف نوعیت کے پندرہ تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مبنی ہے، جو نہ صرف ادبی معیار پر کھرے اترتے ہیں بلکہ قاری کو علم و ادب کی گہرائیوں میں جھانکنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ مضامین ایک طرف علمی اصولوں پر مبنی ہیں تو دوسری طرف ان میں ادب کے لطیف جمالیاتی پہلو بھی نمایاں ہیں۔ 'نکاتِ فن' میں شامل مضامین اردو ادب کے مختلف اور اہم موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان مضامین میں علمی بصیرت، تحقیق کے اصولوں اور تنقیدی بصیرت کا بہترین امتزاج موجود ہے۔ ذیل میں کتاب میں شامل چند اہم مضامین کا جائزہ لیا جا رہا ہے:

پہلا مضمون 'اردو کے اہم مزاحیہ ادیب اور صحافی' ہے۔ یہ مضمون اردو ادب میں مزاح نگاری اور صحافت کے ان اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جنھوں نے قارئین کو تفریح کے ساتھ ساتھ فکر کے مواقع بھی فراہم کیے۔ ڈاکٹر سید الفت حسین نے مزاح نگاروں کے اسلوب، موضوعات اور صحافتی خدمات کا تجزیہ عالمانہ انداز میں کیا ہے، جس سے اردو مزاح کی ترقی اور اس کے سماجی و تہذیبی اثرات واضح ہوتے ہیں۔

دوسرا مضمون 'رپورتاژ نگاری اور مماثل اصناف' ہے۔ رپورتاژ اردو نثر کی ایک دل کش صنف ہے۔ اس مضمون میں اس کے ارتقا، ساخت اور موضوعات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سید الفت حسین نے رپورتاژ اور اس سے مماثل اصناف کے مابین فرق اور ان کے ادبی و سماجی پہلوؤں کا عمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔

کتاب میں شامل ایک عنوان 'صالحہ عابد حسین: پانی پت سے مدینہ منورہ تک' ہے۔ یہ مضمون صالحہ عابد حسین کی زندگی، ادبی خدمات اور روحانی سفر کا جامع احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صالحہ عابد حسین کی علمی و ادبی خدمات کے ساتھ ان کی شخصیت کے مذہبی اور روحانی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے، جو مضمون کو ایک مکمل اور متاثر کن بیانیے میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اس میں شامل ایک اہم مضمون 'پٹنہ یونیورسٹی: گہوارۂ علم و ادب' ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کو اردو ادب کے ارتقا میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے اس کی علمی و ادبی خدمات اور اردو زبان کے فروغ میں اس کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ مضمون نہ صرف تاریخی حوالوں سے مزین ہے بلکہ ادبی تحقیق کے نئے دروازے بھی وا کرتا ہے۔ مادرِ علمی پٹنہ یونیورسٹی جو ۱۹۱۷ء میں قائم ہوئی، ہندوستان کی قدیم ترین جامعات میں ہے اور علمی، ثقافتی اور ادبی لحاظ سے نمایاں مقام رکھتی ہے۔ یہ نہ صرف اعلیٰ تعلیم کی فراہمی کا مرکز رہی ہے بلکہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں بھی اس کا کردار بے مثال ہے۔ یہاں اردو زبان کے مشہور ادیبوں، شاعروں اور محققین نے تعلیم حاصل کی، درس و تدریس سے وابستہ رہے اور اپنی تخلیقات سے اردو ادب کو مالا مال کیا۔

اسی طرح ایک مضمون 'شارب ردولوی کے تنقیدی رویے' ہے۔ شارب ردولوی اردو ادب میں اپنے منفرد تنقیدی انداز کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید الفت حسین نے ان کے تنقیدی اصولوں، ادبی شعور اور تخلیقی اسلوب کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ یہ مضمون ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

'رضا نقوی واہی: سنجیدہ طنز نگار' کے عنوان سے بھی ایک مضمون شامل ہے۔ طنز و مزاح کی دنیا میں رضا نقوی واہی ایک معتبر نام ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے ان کی شاعری میں پائے جانے والے طنز کے سنجیدہ اور مزاحیہ پہلوؤں کی ادبی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا تجزیہ ادب کی اس صنف کے بارے میں نئے زاویے فراہم کرتا ہے۔

'اشفاق نجمی کی نعتیہ شاعری' بھی ایک اہم مضمون ہے۔ اشفاق نجمی کی نعتیہ شاعری عشقِ رسول کے لطیف جذبات اور ادبی معیار کا حسین امتزاج ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی شاعری کے فنی اور معنوی پہلوؤں کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا ہے جو نعتیہ ادب کے مطالعے میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک اور اہم مضمون 'ادب اطفال اور ظفر کمالی کی شاعری' ہے۔ یہ مضمون بچوں کے ادب اور ظفر کمالی کی شاعری کے امتزاج کو پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ادب اطفال کے معیارات، موضوعات

اور ظفر کمالی کی شعری خصوصیات کو منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا تجزیہ بچوں کے ادب کی اہمیت اور اس کے مستقبل کے امکانات کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

سید الفت حسین کا تنقیدی شعور بصیرت اور وسعت کا حامل ہے۔ وہ ادب کی باریکیوں کو بڑی مہارت سے اجاگر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں حوالوں سے مزین ہوتی ہیں۔ ان کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت ادب کی تفہیم، تخلیقی بصیرت اور شعری ونثری متون کی درست جانچ پرکھ کی عکاس ہے۔ وہ کسی بھی تخلیق کے صرف سطحی پہلوؤں کو زیر بحث نہیں لاتے بلکہ اس کے تہ در تہ معانی و مفاہیم بھی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں اعتدال وتوازن قائم ہے جو ادب کی اصل روح تک پہنچنے میں ممد ومعاون ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ 'نکاتِ فن' میں شامل مضامین اردو ادب کی مختلف اصناف اور شخصیات کو ایک نئی جہت فراہم کرتے ہیں۔ موصوف کی عالمانہ بصیرت، تحقیقی اور تنقیدی مہارت نے ان مضامین کو اردو ادب کے سنجیدہ قارئین کے لیے قیمتی اثاثہ بنادیا ہے۔ یہ کتاب تحقیق وتنقید کے طلبہ، اساتذہ اور عام قارئین کے لیے یکساں طور پر مفید وکارآمد ہے۔ اس کی اشاعت پر فاضل مصنف کو تہ دل سے مبارک باد۔



نام کتاب : مظفر فہمی
مرتب : انجینئر فیروز مظفر
صفحات : ۲۸۴ قیمت : ۳۰۰/روپے
سال اشاعت : ۲۰۲۲ء مطبع : ندارد
ناشر : مظفر حنفی میموریل سوسائٹی، مظفر حنفی لین، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی
تبصرہ نگار : فیضان حیدر (معروفی)

فیروز مظفر ایک باصلاحیت انجینئر ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کے رسیا، شعری ذوق کے حامل اور علمی وادبی خدمات کے حوالے سے نہایت متحرک ہیں۔ ان کی علمی وادبی کاوشوں کا دائرہ محدود نہیں بلکہ وہ اردو ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کررہے ہیں۔ ان کی تصنیف 'مظفر فہمی' اردو دنیا کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔

'مظفر فہمی' دراصل مظفر حنفی کی شخصیت، علمی، ادبی اور تخلیقی کارناموں پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے۔

مظفر حنفی اردو ادب کی ایک بلند قامت شخصیت ہیں جنھوں نے نہ صرف شاعری بلکہ تنقید، تحقیق اور ادبی تاریخ کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ فیروز مظفر نے اس کتاب کے ذریعے مظفر حنفی کی شخصیت اور ان کی علمی خدمات کو ایک خوب صورت خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

یہ کتاب مختلف ادبا، محققین اور ناقدین کے مضامین پر مشتمل ہے جن میں مظفر حنفی کی تخلیقی جہات، ان کی علمی و ادبی خدمات اور ان کے فن کی انفرادیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ فیروز مظفر کی یہ کاوش اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ نہ صرف ایک ماہر انجینئر ہیں بلکہ ادب کی باریکیوں کو بھی گہرائی سے سمجھتے ہیں۔

کتاب میں کل پینتیس مضامین شامل کیے گئے ہیں جن میں پروفیسر وہاب اشرفی، ڈاکٹر خوشحال زیدی، فاروق ارگلی، حلیم صابر، پروفیسر محمد نعمان خان، ڈاکٹر افضال عاقل، ڈاکٹر محمد خوشتر، پروفیسر شہزادی اور کئی دوسرے اہم قلم کاروں کے مضامین شامل ہیں۔ اس مختصر تبصرے میں تمام مضامین پر فرداً فرداً تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس میں کچھ مختصر تو کچھ طویل سبھی طرح کے مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔

اس کتاب میں شامل انجینئر فیروز مظفر کی تحریر قابلِ اعتنا ہے۔ اس کو ہم اس کتاب کا لب لباب قرار دے سکتے ہیں۔ اس میں موصوف نے مظفر فہمی کے حوالے سے بڑی نپی تلی گفتگو کی ہے۔ حقیر نے جب 'فیضانِ ادب' کا مظفر حنفی نمبر نکالا تھا تو اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ مظفر حنفی کی شاعری میں پائے جانے والے ان پہلوؤں کی نشاندہی کی جانی چاہیے جن سے ان کے ہم عصر شعرا یا بعد کے شعرا متاثر ہوئے ہیں۔ مظفر حنفی کی شخصیت ایک 'دائرۃ المعارف' کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اب ہم کو مظفر شناسی پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اور اس پر مزید کام کرنے کے لیے محققین و ناقدین کو سامنے آنا چاہیے۔

کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا تحقیقی اور تجزیاتی انداز ہے۔ فیروز مظفر نے مواد کے انتخاب و ترتیب میں خاص دقتِ نظر اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ مضامین کی ترتیب اور پیش کش اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ مصنف نے کتاب کو انتہائی لگن اور محنت سے ترتیب دیا ہے۔ 'مظفر فہمی' ان لوگوں کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے جو مظفر حنفی کے فن اور شخصیت کو سمجھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

یہ کتاب نہ صرف مظفر حنفی کی خدمات کا اعتراف ہے بلکہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم حوالہ بھی ہے۔ فیروز مظفر کی یہ ادبی کاوش قابلِ تعریف ہے اور ان کی علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ مستقبل میں بھی ایسی علمی اور تحقیقی کتب کے ذریعے اردو ادب کے خزانے کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

نام مجلہ	:	سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز (نظم نمبر)			
مدیر	:	ڈاکٹر منصور خوشتر			
صفحات	:	۳۸۴	قیمت	:	۴۰۰؍روپے
سال اشاعت	:	۲۰۲۳ء	مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶
ناشر	:	دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، دربھنگہ			
تبصرہ نگار	:	خورشید عالم انصاری			

خصوصی شمارہ سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز کا 'نظم نمبر' ہے جو اپریل تا جون ۲۰۲۲ء کا شمارہ ہے۔ سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز ایک بین الاقوامی علمی، ادبی اور تحقیقی جریدہ ہے جو دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، دربھنگہ سے مسلسل شائع ہو رہا ہے، جس میں موقر اہل قلم کے علمی، ادبی اور تحقیقی مقالات اور مضامین شامل اشاعت ہوتے ہیں۔ اس جریدے کے مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر ہیں۔

اس کی مجلس ادارت میں پروفیسر عبدالمنان طرزی، پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر محمد آفتاب اشرف، ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر عبدالحی اور ڈاکٹر عبدالرافع صاحبان اور مجلس مشاورت میں حقانی القاسمی، سلمان عبدالصمد، خورشید حیات، انور آفاقی، ڈاکٹر عطا عابدی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد اور فیاض احمد وجیہ صاحبان ہیں۔ مدیر محترم نے جریدے کو چار حصوں میں بانٹا ہے (۱) کلاسیکی ضبط کے ساتھ نظم کا بدلتا مزاج (۲) نظمیہ شاعری کا آنچل اور دل فریب صورت حال (۳) کتابوں کی باتیں (۴) خیال آباد۔

پہلے حصے کی اگر بات کریں تو اس میں مدیر نے اپنے اداریہ 'کہنے کی بات' میں نظم لکھنے والوں کی تعداد غزل کہنے والوں سے کم ہونے پر افسوس کیا ہے اور ساتھ میں پابند نظم کے بجائے نثری نظم لکھنے کے خیال نے ان کو پریشان کر رکھا ہے۔ اسی ضمن میں نظم کے انتخاب، ہیت، شعریات، اسلوب، رجحانات اور امکانات پر مضامین قلم بند کیے گئے ہیں اور مختلف صوبوں جیسے بہار، کرناٹک، مشرقی پنجاب وغیرہ میں اردو نظم کی کیا صورت حال ہے؟ پر بھی بحث کی گئی ہے۔

آزادی کے بعد، ۱۹۸۰ء کے بعد اور اکیسویں صدی میں نظم کے حالات پر غور و فکر کیا گیا ہے۔ پاکستانی نظم پر بھی سیر حاصل گفتگو ہوئی ہے۔ اس حصے میں زبیر رضوی، پروفیسر حنیف کیفی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر محمد توقیر عالم، پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر سید احمد قادری، غلام نبی کمار اور ڈاکٹر صالحہ

صدیقی وغیرہ نے تحقیقی مقالہ لکھ کر اردو اسکالروں کو تحفہ دیا ہے۔

دوسرے حصے میں شخصیات پر مقالہ لکھا گیا ہے۔ مجید امجد، شہریار، ن۔م راشد، مظہر امام، علامہ جمیل مظہری، عبدالغفور شہباز، ڈاکٹر وزیر آغا، اویس احمد، شہپر رسول، زبیر رضوی، رفیع الدین زار اور ڈاکٹر جمال اویسی جیسی شخصیات پر مقالے شامل ہیں۔ اس حصے میں کل ۱۶؍مضامین ہیں۔ چند مقالہ نگاروں کے نام اس طرح ہیں: ڈاکٹر ناصر عباس، ڈاکٹر جمال اویسی، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر احسان عالم، نکہت پروین وغیرہ۔ تیسرے حصے میں کتابوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔

چوتھے اور آخری حصے میں مدیر کو ملے خطوط اور میسیج کا ذکر ہے۔ اس میں زیادہ تر لوگوں نے صحافت پر خصوصی نمبر کی تعریف کی اور منصور خوشتر صاحب کو مبارکباد بھی پیش کی ہے۔ گوپی چند نارنگ اپنے مقالہ میں صفحہ نمبر ۲۹؍ پر یوں فرماتے ہیں:

> ''اس وقت یعنی بیسوی صدی کی آخری دہائی میں اردو نظم کی شعریات تقریباً نصف صدی کا سفر مکمل کر چکنے کے بعد پھر ایک Split سے دو چار اور اضطراب کی زد میں ہیں۔ لیکن اس کا ذکر کرنے سے پہلے حلقہ ارباب ذوق کے شعرا کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ جنھوں نے توقعات پیدا کیں اور نظم کی شعریات کو ایک خاص وضع پر لے آئے۔ موجودہ اضطراب و انحراف ان پیدہ کردہ توقعات اور شعریات کی وضع خاص ہے۔''

پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے اپنے مضمون کے آخر میں صفحہ نمبر ۹۳؍ پر یہ عبارت تحریر کی ہے:

> ''ان نظموں میں اثبات ذات اور وجود کے لیے آزادی بے حد ضروری ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح وجودیوں کے یہاں آزادی کے بغیر وجودیت کا اثبات ممکن نہیں۔ یہاں انسانی ذات کی ٹوٹتی بکھرتی اقدار سے رنج و غم تو پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ جوش و عمل اور آگہی روح انسانی کو ایک نئے جہاں اور امکانات سے آشنا کرتے رہتے ہیں۔''

دربھنگہ ٹائمز کے نظم نمبر کی اشاعت پر مدیر کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ کوشش ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔



Quarterly *FAIZAN-E-ADAB*
An International Refereed Research Value Journal with
Impact Factor: 3.49
Vol. IX, Issue: IV, October to December 2024
RNI: UPURD/2018/74924 —— ISSN: 2456-4001
Website: www.uprorg.in

Address: Urdu And Persian Research Organization, Purana Pura, Kurthi Jafarpur, Mau, U.P. – 275305, Cell: 7388886628, E-Mail: faizaneadab@gmail.com